معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے

جلد ۱۵۱ ماہ مئی ۱۹۹۳ء مطابق ماہ ذیقعدہ ۱۴۱۳ھ عدد ۵

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۳۲۲-۳۲۴

مقالات

عہد صحابہ کا نظام تعلیم و تعلم — مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، مبارکپور ۔ اعظم گڈھ — ۳۲۵-۳۳۸

گیارہویں صدی ہجری کا ایک گمنام مصنف محمد بن جلال شاہی رضوی — جناب عارف نوشاہی صاحب، پاکستان — ۳۳۹-۳۴۸

شیخ علی اصغر قنوجی کی چند دستیاب شدہ تصنیفات — ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی، لکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ — ۳۴۹-۳۵۴

رسالہ "مخزن" (لاہور) — جناب جاوید اختر صاحب، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی — ۳۵۵-۳۷۱

معارف کی ڈاک

مکتوب ڈربن — پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، صدر شعبۂ اردو و فارسی و عربی جامعہ ڈربن جنوبی افریقہ — ۳۷۲-۳۸۰

وفیات

ذکر مالک رام — ضیاء الدین اصلاحی — ۳۸۱-۳۹۴

مطبوعات جدیدہ — "ض" و "ع ص" — ۳۹۵-۴۰۰

شذرات

بھوپال مدھیہ پردیش کا دارالحکومت اور ایک خوبصورت شہر ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ ریاست تھی، جو اپنی خواتین فرماں رواؤں کی زرپاشی، علم دوستی اور معارف پروری کی بنا پر علمی، تعلیمی، ادبی اور دینی حیثیت سے ملک میں ممتاز تھی۔ والیان ریاست کی فیاضیوں سے صرف اس کے ہی نہیں پورے ہندوستان کے اہم علمی و تعلیمی ادارے متمتع ہو رہے تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی جود وسخا نے مصنفِ سیرۃ النبیؐ کو بھی دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل، کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطانِ جمؒ

نواب شاہ جہاں بیگم کے عہد فرخ فال کے گوناگوں کاموں میں سب سے عظیم الشان تاج المساجد کی تعمیر کا منصوبہ ہے جو ان کی وفات کی بنا پر نامکمل رہ گیا۔

۱۹۴۷ء میں انقلاب آیا۔ اور ہوائے حریت کے جھونکوں نے اس علم وادب پرور ریاست کی بساط الٹ دی۔ اور اس کے تانے بانے بکھر گئے۔ علمی و تعلیمی اداروں نے دم توڑ دیے۔ اور فلاحی و تعمیری منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ مایوسی اور شکستگی کی اس ہولناک تاریکی میں غیب سے مولانا حافظ محمد عمران خان ندوی ازہری مرحوم نمودار ہوئے۔ انھوں نے اللہ کی مدد، بزرگوں اور اہل دل کی دعا اور اپنے ایثار پسند، پیکر خلوص اور اولوالعزم رفقائے کار کے تعاون سے مریض و مضمحل قوم میں روح حیات پھونک دی۔ اور جو کام ریاست کے گوناگوں وسائل کے باوجود انجام نہیں پا سکا تھا اسے ایک گدائے بے نوا کے اخلاص، حسن نیت، جوش عمل اور مرد خدا کے عزم و یقین کامل نے انجام دے دیا ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں علم دین کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ مگر اس نے مخالف ہواؤں میں اسے روشن کرنے کا بیڑہ اٹھایا، مسجد کی تعمیر بھی مکمل کی اور اسے آباد رکھنے کے لیے دارالعلوم بھی قائم کیا۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

دارالعلوم تاج المساجد کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ عموماً دسمبر میں سالانہ تبلیغی اجتماع کے موقع پر ہوا کرتا تھا، اس قدر خوش اسلوبی سے اتنے بڑے اجتماع کا نظم و انصرام مولانا مرحوم اور ان کے جانشین ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سال دسمبر میں بھوپال مقتل بنا ہوا تھا۔ اس لیے جلسۂ انتظامیہ ۲۷ر اپریل کو ہوا جس میں شرکت کے لیے مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے ساتھ گیا تو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ دارالعلوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ بھوپال اور مضافات میں بیس سے زیادہ اسکی شاخیں قائم ہو گئی ہیں۔ دارالطعام، دارالمطالعہ اور دارالاقامہ کی شاندار عمارتیں بن کر تیار ہو گئی ہیں۔ کتب خانہ (سلیمان ہال) کی پرشکوہ اور مستحکم عمارت جو کئی برس سے تعمیر ہو رہی ہے، اب آخری مرحلہ میں ہے۔ مولانا منظور سرورش امیر دارالعلوم مولانا حبیب ریحان خان ندوی معتمد تعلیم، مولانا محمد لقمان خان ندوی مہتمم اخلاص و جانفشانی سے دارالعلوم کے ہر کام میں منہمک رہتے ہیں، ہم لوگوں کی میزبانی بھی بڑے خلوص اور گرمجوشی سے کی۔ ڈاکٹر احسان خان لیکچرر شعبہ عربی بھوپال یونیورسٹی نے یونیورسٹی کی سیر کرائی۔ مولانا محمد سعید مجددی اور مفتی عبدالرزاق جنرل سکریٹری جمعیۃ علمائے ہند سے ملاقات اور مولانا محمد عمران خان اور حضرت شاہ یعقوب مجددیؒ کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کی سعادت میسر آئی اور طلبہ و اساتذہ سے خطاب بھی کیا گیا۔

اعظم گڈھ ایک پس ماندہ ضلع ہے۔ اسے آمد و رفت کی موجودہ سہولتیں بھی میسر نہیں ہیں۔ تاہم یہ علمی و تعلیمی اداروں کا مرکز اور بڑا مردم خیز ہے۔ یہاں کے قصبات میں کئی بڑے دینی مدارس عرصے سے قائم ہیں اور اب تو بعض دیہاتوں میں بھی بڑے بڑے مدرسے قائم ہو گئے ہیں۔ جن میں جامعہ اسلامیہ مظفرپور نمایاں ہے، یہ ہمارے لائق دوست مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ تعلیمی اسکول، انٹر کالج اور ڈگری کالج ان کے علاوہ ہیں۔ ان تعلیمی اداروں سے دوسرے اضلاع اور صوبوں کے مسلمان طلبہ بھی فیضیاب ہو رہے ہیں۔ بینا پارہ اسی ضلع کا ایک چھوٹا گاؤں ہے۔ مگر اس کے ذی شعور اور حوصلہ مند افراد نے پہلے ہائی اسکول اور انٹر کالج قائم کیا۔ پھر ابن سینا طبیہ کالج کی داغ بیل ڈالی جو صرف اعظم گڈھ بلکہ ہندوستان کے کسی گاؤں میں قائم ہونے والا پہلا طبی کالج ہے۔ ابھی تک چار سالہ ڈپلوما نصاب مکمل کرکے چار سو طلبہ فارغ ہوئے ہیں۔

آئندہ تعلیمی سال میں ڈگری کورس میں داخلہ شروع ہونا متوقع ہے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس طرح کے اداروں کا قیام ایک اہم قومی و ملی ضرورت ہے۔

ابن سینا طبیہ کالج میں ۲۳ تا ۲۵ اپریل کو آل انڈیا طبی کانفرنس کا سالانہ صوبائی اجلاس اور علم الادویہ پر ایک قومی سیمینار ہوا۔ جس میں صوبہ اور اسکے باہر کے تقریباً ڈیڑھ سو اطبا شریک تھے۔ حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ اور چانسلر جامعہ ہمدرد دہلی نے کرسی صدارت کو زینت بخشی اور مشہور سیاسی رہنما چندر جیت یادو نے افتتاح کیا۔ پروفیسر رشید الظفر وائس چانسلر جامعہ ہمدرد، حکیم سیف الدین احمد مشیر اعزازی یونانی مرکزی وزارت صحت و خاندانی بہبود دہلی، حکیم سید خلیفۃ اللہ، جناب آر۔ کے۔ نکھی ڈائرکٹر سی۔ سی۔ آر۔ یو۔ ایم اور حکیم سید ظل الرحمن ندوی صدر شعبۂ علم الادویہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے رونق بڑھائی۔ ان کی اور دوسرے مندوبین کی تشریف آوری سے ویرانہ میں بہار آگئی تھی۔ کانفرنس اور سیمینار کے جلسے بیک وقت تین روز تک بڑی خوبی سے ہوئے۔ راقم کو بھی افتتاحی جلسہ میں حاضری اور دارالمصنفین میں طبیبوں کے قافلہ کی پذیرائی کا موقع ملا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں اس قدر سلیقے سے اتنی بڑی تقریب انجام دینے کیلئے حکیم سید ظل الرحمن ندوی، پرنسپل حکیم ارشاد احمد، سکریٹری حاجی نیاز احمد اور ابن سینا طبیہ کالج کے تمام ارکان، اساتذہ اور طلبہ قابل مبارکباد ہیں۔

---

۱۵ اپریل کو تھوڑے وقفوں سے اردو کے تین اہل قلم کی وفات ہوگئی۔ جناب مالک رام صاحب پر اسی شمارہ میں مفصل مضمون دیا جارہا ہے۔ مفتی شوکت علی فہمی کا اصل وطن میرٹھ تھا۔ وہاں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد تحریک عدم تعاون سے متاثر ہوئے اور انگریزی تعلیم چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور دین دنیا کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور متعدد دینی و تاریخی کتابیں لکھیں جو زیادہ معیاری تو نہیں ہیں لیکن ان سے بڑا فیض پہونچا۔ جناب گوپال متل اردو کے مشہور ادیب و شاعر اور صحافی و مترجم تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مغربی پنجاب سے ترک وطن کرکے دلی میں آبسے تھے۔ یہیں سے ماہنامہ تحریک جاری کیا جو ۲۷ برس تک پابندی سے نکلتا رہا۔ ان کی تصانیف میں "لاہور کا جو ذکر کیا" اور "صحرا میں اذان" وغیرہ بہت مقبول ہوئیں۔ متل صاحب نے اشتراکیت کی تردید میں درجنوں کتابوں کے ترجمے کیے اور دوسروں سے کرائے۔ انکی بدولت اردو کی تاریخ میں ان کا نام ثبت ہوگا۔

مقالات

عہد صحابہؓ کا نظامِ تعلیم و تعلم

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

(۲)

اثنائے درس میں خوش وقتی اور تفریحی باتیں

حضرات صحابہ اپنی مجلسوں میں نہایت انبساط و نشاط کے ساتھ تعلیم دیتے تھے، وہ نرے خشک نہیں تھے بلکہ خوش طبع، خوش خلق اور خوش وقت تھے، اپنے تلامذہ کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے، موقع بہ موقع تفریحی اور خوش کن باتیں کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ دلوں کو سکون دو اور ان کے لیے حکمت کے لطائف و ظرائف تلاش کرو، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ بدن کی طرح دل بھی ملول ہوتے ہیں، ان کے لیے حکمت کے لطائف و ظرائف تلاش کرو، حضرت ابو درداءؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے آپ کو باطل اور غلط چیز سے بہلاتا ہوں تاکہ اس کے ذریعہ حق اور صحیح بات کے بارے میں قوت ملے، حضرت علیؓ کا یہ قول بھی ہے کہ جب دل پر جبر کیا جائے گا تو اندھا ہو جائے گا۔[1] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر پنجشنبہ کو وعظ بیان کرتے تھے ان کا وعظ بڑا موثر ہوتا تھا، لوگوں نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے ان سے کہا کہ کیا اچھا ہو کہ آپ ہم کو روزانہ وعظ سنایا کریں، حضرت ابن مسعودؓ نے کہا کہ مجھکو تم لوگوں کے جمع ہونے کی خبر ملتی ہے مگر میں تمہاری گھبراہٹ اور اکتاہٹ کو پسند نہیں کرتا، رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] الفقیہ والمتفقہ، وجامع بیان العلم وغیرہ۔

علیہ وسلم اسی خیال سے ہم لوگوں کو ناغہ ناغہ سے وعظ سنایا کرتے تھے[1]

ایک مرتبہ حضرت زید بن ثابتؓ کے تلامذہ نے ان سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ عادات واخلاق بیان کیجئے، حضرت زیدؓ نے بتایا کہ جب ہم دنیا کی باتیں کرتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ دنیا کی باتیں کرتے اور جب ہم آخرت کی باتیں کرتے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ آخرت کی باتیں کرتے اور جب ہم کھانے کی باتیں کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ کھانے کی باتیں کرتے، میں یہ تمام باتیں تم لوگوں سے بیان کروں گا، حضرت جابر بن سمرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت، قلیل الضحک تھے (زیادہ خاموش رہتے تھے اور کم ہنستے تھے) بسا اوقات صحابہ آپؐ کے سامنے اشعار پڑھتے تھے اور اپنی باتیں کرکے ہنستے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبسم فرما دیتے تھے[2] ابو خالد والبیؒ کا بیان ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مجلسوں میں بیٹھا کرتے تھے، وہ حضرات آپس میں اشعار سنتے سناتے تھے اور زمانۂ جاہلیت کی جنگوں کا تذکرہ کرتے تھے[3] ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نہ منقبض تھے نہ ان پر مردنی چھائی رہتی تھی، بلکہ وہ اپنی مجلسوں میں اشعار سنتے سناتے تھے اور دورِ جاہلیت کے واقعات بیان کرتے تھے اور جب ان میں سے کسی کو اللہ کے حکم کی دعوت دی جاتی تھی تو آنکھوں میں گردش ہونے لگتی تھی جیسے وہ دیوانہ ہے[4] حضرت ابو ہریرہؓ بڑے خوش مزاج

[1] بخاری ج ۱ [2] الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص۱۱۰ وص۱۱۱ [3] جامع بیان العلم ج ۱ ص۱۰۵
[4] الادب المفرد، باب الکبر۔

اور ظریف الطبع انسان تھے ان کی مجلس میں اس قسم کی باتیں زیادہ ہوتی تھیں، ابن ابی ملیکہؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ ابن عباسؓ کی مجلس میں گئے تو انھوں نے کہا کہ تم لوگوں کو جو کچھ پوچھنا ہو مجھ سے پوچھو، آج میری طبیعت میں نشاط وانشراح ہے، سورۂ بقرہ اور سورۂ یوسف کے بارے میں سوال کرو[1] ابن جبیر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن عباسؓ نے مجھ سے کہا کہ تم مجھ سے ایک آیت کی تفسیر کیوں پوچھتے ہو جس میں ایک سو آیت ہے فَتَنَّاكَ فُتُوناً، ہر خیر فتنہ ہے، ہر شر فتنہ ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات کے مطابق حضرات صحابہ اپنی مجلسوں اور حلقوں میں بعض اوقات تفریحی باتیں بیان کرتے تھے اور طالب علموں میں نشاط باقی رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً خوش کن واقعات واشعار سناتے تھے۔

طلبہ کو تحصیلِ علم کی تاکید

اسی کے ساتھ حضرات صحابہ طلبہ کی ہمت افزائی اور تشجیع بھی کرتے تھے، تحصیلِ علم کی ترغیب دیتے تھے، امتحان لیتے تھے اور اپنے سامنے ان سے فتویٰ دلاتے تھے، تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کا طریقہ سکھاتے تھے، حضرت ابن مسعودؓ کہا کرتے تھے کہ اے لوگو! علم حاصل کرو، تم نہیں جانتے ہو کہ کب تمھاری ضرورت پڑ جائے گی، یا تمہارے پاس جو علم ہوگا اس کی احتیاج ہوگی، اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ علم کے سرچشمے، ہدایت کے چراغ، گھروں کی زینت، راتوں کے چراغ، نئے دل، پرانے کپڑے والے بنو، زمین والوں سے پوشیدہ رہ کر آسمان والوں میں پہچانے جاؤگے، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابوذرؓ ..... کہتے ہیں کہ علم کا ایک باب سیکھنا ہمارے نزدیک ہزار رکعت نفل نماز سے افضل ہے اور علم کا ایک

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص۱۱۵۔

باب جس کو آدمی دوسرے کو سکھائے اس پر عمل کرے یا نہ کرے ہمارے نزدیک ستر رکعت نفل نماز سے بہتر ہے[1]۔

باہم مذاکرہ کی تاکید

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ تم لوگ آپس میں مل کر بیٹھو اور حدیث کا مذاکرہ کرو، اگر ایسا نہیں کروگے تو حدیث جاتی رہے گی، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ تم لوگ حدیث کا مذاکرہ کرو، اس کی حیات مذاکرہ سے ہے، نیز کہتے ہیں کہ تم لوگ ان حدیثوں کا مذاکرہ کرو تاکہ وہ بے قابو نہ ہو جائیں، حدیث قرآن کی طرح نہیں ہے، قرآن محفوظ و مجموع ہو چکا ہے، اگر حدیث کا مذاکرہ نہیں کروگے تو تمہارے قابو سے باہر ہو جائے گی، تم یہ نہ کہو کہ میں کل تو یہ حدیث بیان کر چکا ہوں، آج نہیں بیان کروں گا بلکہ گذرے ہوئے دن بھی بیان کرو، آج بھی بیان کرو اور کل بھی بیان کرو، جب تم کوئی حدیث ہم سے سنو تو آپس میں اس کا مذاکرہ کیا کرو، ایک ساعت علم کا مذاکرہ ایک رات کی عبادت سے بہتر ہے، حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ تم لوگ آپس میں حدیث کا مذاکرہ کیا کرو، اس لیے کہ مذاکرہ سے بعض حدیث بعض حدیث کو یاد دلادیتی ہے[2]۔

ایک رات ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے، حضرت عمرؓ نے ناوقت آنے کا سبب معلوم کیا تو ابو موسیٰ نے کہا کہ ہم فقہ کا مذاکرہ کریں گے، اس کے بعد دونوں حضرات رات گئے تک مذاکرہ کرتے رہے، ابو موسیٰ نے کہا کہ نماز کا وقت ہو رہا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم لوگ ابتک نماز ہی میں مصروف تھے (یعنی نماز کا

---

۱ جامع بیان العلم ج ۱ ص ۲۵ و ص ۹۰ و ص ۱۲۶ ۔ ۲ شرف اصحاب الحدیث ص ۹۴ و ۹۵، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۹ ۔

ثواب ہم کو ملتا رہا) پھر مذاکرہ کرتے رہے یہانتک کہ نماز فجر کا وقت آگیا[1]۔

حفظ حدیث اور کتابت حدیث کی تاکید

حضرات صحابہ میں بعض حفظ حدیث کو ترجیح دیتے تھے اور بعض کتابت حدیث پر زور دیتے تھے اور اپنے اپنے طالب علموں کو اپنے اپنے طریقہ پر عمل کرنے کی تاکید کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ کتابت حدیث کے حق میں نہیں تھے مگر بعد میں اس کی اجازت دیدی، کہتے تھے کہ ہم علم کو نہ لکھتے ہیں، نہ لکھاتے ہیں، مگر ان کے شاگرد ہارون بن عنترہ کہتے ہیں کہ ابن عباس نے ان کو لکھنے کی اجازت دی تھی، ابو نضرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید خدری سے کہا کہ ہم آپ سے جو کچھ سنتے ہیں کیا ان کو لکھ لیا کریں؟ انھوں نے کہا کہ کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ مجھ سے سنی ہوئی باتوں کو مصحف بناؤ؟ تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے حدیث بیان فرماتے تھے اور ہم یاد کر لیتے تھے، جس طرح ہم لوگ یاد کرتے تھے تم لوگ بھی یاد کرو[2]۔

تدریس و افتاء کی تعلیم و تربیت

سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن عباسؓ نے مجھ سے کہا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کس طرح حدیث بیان کرتے ہو، یہ سن کر میں گھبرایا تو کہا کہ کیا تم پر اللہ کا یہ احسان نہیں ہے کہ تم میرے سامنے حدیث بیان کرو، اگر صحیح طور سے بیان کرتے ہو تو سبحان اللہ اور اگر غلطی کرتے ہو تو میں تصحیح کر دوں[3]، حجاج بن عمرو بن عزیہ کہتے ہیں کہ میں زید بن ثابتؓ کی مجلس میں تھا، ایک شخص نے ان سے فتویٰ پوچھا تو مجھ سے کہا کہ تم فتویٰ دیدو، میں نے کہا کہ ہم آپ کے پاس تحصیل علم کے لیے آتے ہیں پھر بھی زید بن ثابتؓ نے اس کا حکم دیا اور میں نے فتویٰ دیکر کہا کہ میں نے زید بن

---

۱ الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص ۱۲۵ ۔ ۲ جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۴ و ص ۶۳، ۳ طبقات ابن سعد۔

ثابتؓ سے ایسا ہی سنا ہے، اس پر انھوں نے کہا کہ زید نے صحیح کہا[1] حضرت ابن عباسؓ اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ لوگوں کو ہر جمعہ (ہفتہ) میں ایک مرتبہ حدیث کی تعلیم دو، اگر اس سے انکار ہے تو دو مرتبہ اور اگر بہت زیادہ چاہتے ہو تو تین مرتبہ تعلیم دو اور لوگوں کو قرآن سے غافل نہ کرو، لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہوں تو تم جا کر ان کی بات مت کاٹو، بلکہ خاموش رہو اور وہ خواہش ظاہر کریں تو حدیث بیان کرو' حضرت ابن مسعودؓ اپنے تلامذہ سے کہتے تھے کہ جب تک لوگ پوری توجہ سے تمہاری طرف دیکھتے رہیں تم حدیث بیان کرو اور جب وہ نظر نیچی کر لیں تو رک جاؤ، نیز کہتے تھے کہ اپنی نیکی کو ایسے شخص کے سامنے نہ پھیلاؤ جو اس کی خواہش نہ کرے (تدریب الراوی ص۳۴۴ والمحدث الفاصل ص۵۹۱)

مختلف علوم میں ممتاز صحابہ یوں تمام ہی صحابہ آسمان نبوت کے ستارے اور علوم نبوت کے حامل تھے، مگر کچھ حضرات ان میں نمایاں تھے اور عام دینی علوم تفسیر و تاویل، حدیث، فقہ و فتوی کے ساتھ بعض علوم میں ممتاز تھے، حضرت صہیب بن سنان رومی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و اسفار بیان کرتے تھے اور حدیث نہیں بیان کرتے تھے، کہتے تھے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں بیان کروں گا، اگر تم لوگ چاہو تو آپؐ کے غزوات و اسفار کو بیان کر دوں[2]۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت صہیبؓ کہا کرتے تھے آؤ میں تم لوگوں سے اپنے غزوات بیان کروں، مگر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہوں گا[3]۔

---

[1] جامع بیان العلم ج۱ ص۱۲۱ و ص۱۱۵ [2] کتاب الثقات، ابن حبان ج۴ ص۳۱ [3] طبقات ابن سعد ج۳ ص۲۲۹۔

حضرت ابن عباس اپنی مجلس میں ایک دن صرف فقہ، ایک دن صرف تفسیر، ایک دن صرف مغازی' ایک دن صرف اشعار اور ایک دن صرف عرب کی لڑائیوں کو بیان کرتے تھے[1]

حضرت عقیل بن ابو طالب قریش کے انساب و حروب اور ان کے محاسن و مثالب بیان کرتے تھے[2]، حضرت سعد بن وقاص وعظ و تذکیر اور تحدیث و تفقہ کے انداز کے بجائے اپنی مجلس میں عام لوگوں کی طرح گفتگو کرتے تھے اور درمیان میں احادیث و جہاد کے واقعات اور اخلاق سے متعلق باتیں بیان کرتے تھے[3] حضرت ابن عباسؓ تفسیر و تاویل میں' حضرت ابی بن کعب قراءت قرآن میں، حضرت معاذ بن جبل حلال' حرام کے علم میں' حضرت زید بن ثابتؓ فرائض میں' حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تفقہ میں اور کئی صحابہ مختلف علوم میں ممتاز تھے اور یہ سب حضرات حدیث اور فقہ و فتوی کے ساتھ اپنے مخصوص علم کا درس بھی دیتے تھے۔

مجلسوں اور حلقوں کی ہیئت و کیفیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر کے بعد ستون ابو لبابہ کے پاس تشریف لاتے تھے اور صحابہ اس طرح حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے تھے کہ سب کا چہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کی طرف ہوتا تھا، صحابہ کرام کی مجلس اور حلقہ کا یہی طریقہ تھا اور وہ بھی مسجد نبویؐ کے ستون کے پاس بیٹھتے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے مسجد نبویؐ کی تعمیر و توسیع کے وقت پتھر کے ستون لگوائے تھے اور مسجد بھی وسیع و عریض اور پختہ تعمیر کرائی تھی، تقریباً ہر ستون کے پاس حلقۂ درس ہوتا تھا، حضرت ابن مسعودؓ کے ایک شاگرد نے اس دور میں مسجد نبویؐ میں مجلسوں

---

[1] طبقات، ابن سعد ج۲ ص۳۶۵ [2] اصابہ ج۴ ص۲۵۵ [3] تاریخ کبیر ج۲ قسم ۱ ص۱۲۴۔

اور حلقوں کی کثرت کا ذکر بڑے بلیغ وفصیح انداز میں یوں کیا ہے:

عهدی بهذا المسجد،	اس مسجد میں میرا وہ دور گذرا ہے
وانه لمثل الروضة اخضر	جب کہ یہ باغیچہ کے مانند تھی تم اسکے
منها حيث شئت [1]	جس درخت کے سایہ میں چاہو بیٹھ جاؤ۔

شیوخ واساتذہ تخت پر بیٹھتے تھے، اصحاب وتلامذہ اسی کے قریب نیچے بیٹھتے تھے، مجلس وحلقہ میں اعیان واشراف، عوام وخواص، مقامی، بیرونی اور عربی وعجمی سب طلبہ برابر برابر بیٹھتے تھے، اساتذہ بعض طلبہ کو ان کے مقام ومرتبہ یا قرأت کی وجہ سے اپنے تخت پر، یا اپنے قریب بیٹھاتے تھے، طلبہ کی کثرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی مجلس میں ابو جمرہ خاص طور سے مجمع میں آواز پہونچانے اور عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے کے لیے رکھے گئے تھے، اساتذہ کے احترام وادب کا لحاظ کرتے ہوئے طلبہ سوال کرتے تھے اور کافی وشافی جواب پاتے تھے، بعض اساتذہ نشاط میں ہوتے تو طلبہ سے خود سوال کرنے کی فرمائش کرتے تھے، حضرت علیؓ اور ابن عباس سے ایسے واقعات منقول ہیں، حضرت ابو سعید خدری نے ایک مرتبہ مجلس میں اپنے نوجوان تلامذہ کے سوالات کے جوابات دینے کے بعد اس قدر زیادہ حدیث بیان کی کہ وہ سب گھبرا گئے [2] کبھی کبھی اہل مجلس میں نشاط پیدا کرنے کے لیے مجلس کا رنگ بدل جاتا تھا، شعر وشاعری ہونے لگتی تھی، زمانۂ جاہلیت کی جنگوں کے تذکرے ہونے لگتے تھے، مذاقی باتیں بھی ہوتی

---

[1] المحدث الفاصل ص۱۰۱ [2] الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص۱۱۶۔

تھیں مگر مجلس کا وقار ہر حال میں باقی رہتا تھا، اثنائے درس میں اساتذہ وتلامذہ کثرت سے استغفار اور دعا کرتے رہتے تھے اور مجلس کے خاتمہ پر صحابہ اپنے اور اہل مجلس کے لیے دعا کرکے اٹھتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایسے موقع پر یہ دعا پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو پڑھتے تھے۔

اللهم اقسم لنا من خشيتك	اے اللہ! ہم کو اپنی خشیت دے
ما تحول بيننا وبين معصيتك	جو ہمارے اور تیری معصیت کے
ومن طاعتك ما تبلغنا به	درمیان حائل ہوجائے اور اپنی
الى حبك، ومن اليقين	اطاعت دے جو ہم کو تیری محبت
ما تهون علينا مصائب	عطا کرے اور یقین دے جس سے
الدنيا به، اللهم متعنا	ہم پر دنیا کے مصائب آسان ہوجائیں
باسماعنا وابصارنا	اے اللہ! جب تک تو ہم کو زندہ رکھے
وقوتنا ما احييتنا واجعله	ہمارے کان، ہماری آنکھ، ہماری قوت
الوارث منا، واجعل ثارنا	سے ہم کو نفع پہونچا اور ہماری طرف
على من ظلمنا وانصرنا	سے اس تمتع کو وارث بنا اور ہمارے
على من عادانا، ولا تجعل	خوں بہا کو ہمارے ظالموں پر ڈال
مصيبتنا في ديننا ولا تجعل	دے اور ہمارے دشمنوں کے مقابلہ
الدنيا اكبر همنا ولا مبلغ	میں ہماری مدد فرما! اور ہم کو دینی
علمنا، ولا تسلط علينا من	مصائب میں مبتلا نہ فرما اور دنیا
لا يرحمنا [1]	کو ہمارا سب سے بڑا مقصد اور

---

[1] عمل الیوم واللیلۃ، لابن السنی ص۱۲۰۔

ہمارے علم کا منتہیٰ نہ بنا اور ہم پر
ایسے فرد یا قوم کو مسلط نہ کر جو ہم پر
رحم نہ کرے۔

مجلس اور حلقہ کے اوقات اور دن

ان تعلیمی مجالس کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ ان کا انعقاد روزانہ ہوتا تھا، یا ہفتہ میں چند دن، اسی طرح ان کے اوقات کا علم بھی نہیں ہے، عام طور سے یہ مجلسیں صبح کو فجر کے بعد قائم ہوتی تھیں اور دن میں دوسرے اوقات میں بھی تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا، حضرت ابن عباس کا معمول تھا کہ ایک دن فقہ، ایک دن تفسیر، ایک دن مغازی، ایک دن اشعار اور ایک دن ایام عرب کی تعلیم دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی مجلسوں اور حلقوں کا انعقاد وقفہ وقفہ سے ہوتا تھا، البتہ کچھ حضرات روزانہ درس دیتے تھے اور اہل علم اس میں معمول کے مطابق بیٹھتے تھے، عہد صحابہ کے بہت بعد تک تحدیث و روایت کی مجلسیں اور حلقے قائم ہوتے تھے، جن میں محدثین املاء کراتے تھے ان کے اوقات اور دن کے بارے میں بھی صحیح معلومات نہیں ہیں، امام سیوطی لکھتے ہیں:

لم اظفر لاحد بتعیین یوم الاملاء ولا وقته[1]	کسی شیخ کے املاء کرانے کے وقت اور دن کی تعیین مجھے نہیں ملی۔

غالباً دور اسلاف میں یہ مجلسیں آسانی اور حالات کے پیش نظر مختلف اوقات و ایام میں منعقد ہوتی تھیں

۱؎ تدریب الراوی ص ۳۴۳۔

جمعہ کی تعطیل

عہد رسالت میں نماز جمعہ سے پہلے مسجد نبوی میں تعلیمی حلقے نہیں ہوتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی تھی، سنن ابوداؤد میں باب التحلق یوم الجمعة قبل الصلوٰة میں روایت ہے کہ:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن الشراء والبيع في المسجد وان تنشد فيه ضالة وان ينشد فيه شعر، ونهى عن التحلق قبل الصلوٰة يوم الجمعة[1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں خرید و فروخت، گمشدہ چیز کی تلاش اور شعر پڑھنے سے منع فرمایا ہے اور جمعہ کی نماز سے پہلے حلقہ قائم کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جمعہ کے دن صبح ہی سے قریات و عوالی مدینہ سے مسلمان مسجد نبوی میں آتے تھے اور ذکر و اذکار اور نوافل میں مشغول رہتے تھے یا دینی معلومات حاصل کرتے تھے اس لیے نماز سے پہلے تعلیمی حلقے نہیں ہوتے تھے صحابہ کرام نے اپنے دور میں اسی پر عمل کیا، البتہ نماز سے پہلے وعظ و تذکیر کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ منبر کے پاس کھڑے ہو کر وعظ بیان کرتے تھے بعد میں جب مدارس کا باقاعدہ قیام ہوا تو جمعہ کی تعطیل کا رواج اسی سنت کے مطابق عام ہوا۔

مقامی اور بیرونی طلبہ

مدینہ منورہ کی تعلیمی مجالس و حلقات میں مقامی اور بیرونی دونوں قسم کے طلبہ شریک ہوتے تھے، مقامی لوگ مستقل طور سے حاضر باش رہ کر فقہ و فتویٰ

۱؎ سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۶۱۔

اور حدیث میں شیخ مجلس کے متبع اور ان کے علم کے ناشر و ترجمان ہوتے تھے اور ان کا شمار خصوصی تلامذہ و اصحاب میں ہوتا تھا مثلاً حضرت زید بن ثابتؓ کے اصحاب سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، قبیصہ بن ذویب، خارجہ بن زید بن ثابت، سلیمان بن یسار، ابان بن عثمان بن عفان، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ، قاسم بن محمد بن ابوبکر، سالم بن عبد اللہ بن عمر، ابوبکر بن عبد الرحمٰن، طلحہ بن عبد اللہ بن عوف، نافع بن جبیر بن مطعم علمائے تابعین کے ذریعہ حضرت زیدؓ بن ثابت کا فقہی مسلک مدینہ میں عام ہوا اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے شاگرد عطار بن ابی رباح، مجاہد بن جبیر، طاؤس بن کیسان، جابر بن زید، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ، سعید بن جبیر نے مکہ میں حضرت ابن عباسؓ کے مسلک کی اشاعت کی، اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے تلامیذ علقمہ بن قیس، اسود بن یزید، مسروق بن اجدع، عبیدہ سلمانی، حارث بن قیس، عمر بن شرحبیل نے کوفہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کے مسلک کو رائج کیا، اسی طرح دوسرے صحابہ کے حلقہ نشینوں نے ان کے فقہ و فتویٰ اور احادیث و مرویات کو اپنے اپنے حلقہ میں عام کیا اور غیر مقامی حضرات چند دن یا چند ہفتہ یا اس سے کم و بیش مدت تک مجلس میں شریک ہوکر اپنے اساتذہ و شیوخ کی احادیث اور اقوال و آرا سنکر واپس چلے جاتے تھے اور اپنے اپنے شہروں میں عام کرتے تھے، اس دور میں جس شہر یا ملک میں کسی صحابی کا پتہ چلتا اہل علم سفر کرکے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کی احادیث حاصل کرکے واپس ہو جاتے تھے، حد یہ ہے کہ ایک ایک حدیث کے لیے سفر کیا جاتا تھا، حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے ایک حدیث کے لیے ملک شام کا سفر کیا تھا، حضرت ابو درداءؓ کے پاس دمشق میں ایک آدمی مدینہ سے صرف ایک

حدیث کے لیے حاضر ہوا تھا، امام زہری کہتے ہیں کہ ایک حدیث کے لیے آدمی مدینہ کا سفر کرتا تھا، ابو قلابہ کہتے ہیں کہ میں کئی دن مدینہ میں مقیم رہا تاکہ ایک شخص سے ایک حدیث سنوں، مختلف مقامات کے تابعین سند عالی اور روایت کی اجازت کے لیے مدینہ آتے تھے، ابو العالیہ رباحی کہتے ہیں ہم لوگ بصرہ میں صحابہ سے حدیث سنتے تھے اور مدینہ جاکر وہاں کے صحابہ سے اس کو سنتے اور مطمئن ہوتے تھے، ابن جبیر کا بیان ہے میں نے چند حدیثیں کوفہ میں ایک صحیفہ میں جمع کی تھیں، بعض احادیث کے بارے میں ہم لوگوں میں اختلاف ہوگیا تو میں نے عبد اللہ بن عمر کے پاس آکر ان کو پڑھا اور ان کے بارے میں سوالات کیے، عکرمہ مولیٰ ابن عباس کا بیان ہے کہ طائف کے کچھ اہل علم حضرت ابن عباس کی لکھی ہوئی حدیثیں لے کر آئے اور ابن عباس نے ان کو ان لوگوں کے سامنے پڑھا، یعنی ان کی تصدیق کی، بشیر بن نہیک کا بیان ہے کہ میں ابو ہریرہؓ سے حدیث سنکر لکھ لیتا تھا جب واپس جانے لگا تو وہ کتاب ان کو پڑھ کر سنائی اور کہا کہ کیا میں نے ان کو آپ سے نہیں سنا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں تم نے مجھ سے سنا ہے، ان چند مثالوں سے معلوم ہوجاتا ہے کہ مدینہ کی تعلیمی مجالس میں بیرونی طلبہ کی حاضری وقتی طور پر ہوتی تھی اور وہ چند دنوں قیام کرکے حدیث کی روایت کرتے اجازت لیتے، تصدیق کراتے اور سند عالی لے کر واپس چلے جاتے تھے،

طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام

عہد رسالت میں مقامی اور بیرونی دونوں قسم کے طلبہ کے قیام و طعام کا باقاعدہ انتظام تھا، مقامی طلبہ یعنی فقراء و مساکین اور اصحاب صفہ مسجد نبویؐ میں قیام کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور باحیثیت صحابہ ان کو اپنے گھروں میں لے جاکر کھلاتے تھے، مسجد نبویؐ میں صحابہ ان کے لیے کھجور اور پانی رکھتے تھے، بیرونی طلبہ

یعنی ازواد اور وفود "دار رملۃ بنت حارث" میں ٹھہرائے جاتے تھے جو دار الضیافہ کے نام سے مشہور تھا اور اس میں چھ سات سو آدمیوں کے قیام کی گنجائش تھی، ان کے طعام کا انتظام حضرت بلالؓ کے ذمہ تھا مگر عہد صحابہ میں مقامی اور غیر مقامی طلبہ کے قیام وطعام کے بارے میں تصریح نہیں ملتی ہے، اس زمانہ میں حالات بدل چکے تھے، تنگی کی جگہ کشادگی اور بدحالی کی جگہ خوشحالی آگئی تھی، مقامی طلبہ کو دوسری جگہ قیام وطعام کی ضرورت نہیں تھی اور بیرونی طلبہ چند دنوں تک ضیافت میں رہتے تھے، یا اپنے متعلقین کے یہاں قیام کر لیتے تھے۔

جیساکہ معلوم ہو چکا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو وصیت فرمائی کہ میرے بعد حدیث اور علم کی طلب میں اطراف واکناف سے نوخیز و نوجوان آئیں گے تم ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اور ہر طرح سے ان کی خبرگیری کرنا، اس وصیت ونصیحت کے مطابق حضرات صحابہ اور اہل مدینہ ان بیرونی طلبہ کا بڑھ کر استقبال کرتے تھے اور ان مہمانانِ رسولؐ کی میزبانی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔

گیارہویں صدی ہجری کا ایک گمنام مصنف
محمد بن جلال شاہی رضوی

از جناب عارف نوشاہی صاحب پاکستان

محمد بن جلال شاہی رضوی ہندوستانی مصنف ہیں، ان کی چند فارسی تصانیف دستیاب ہیں مگر خود ان کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے، انکی تصانیف کے مطالعہ سے یہ باتیں سامنے آئی ہیں:

الف - وہ ۴۲-۱۰ھ/۱۶۳۲ء میں بقید حیات تھے۔

ب - انہیں شاہ عالم گجراتی (م ۸۸۰ھ) سے خاص ارادت تھی۔ نام کے ساتھ نسبت "شاہی" غالباً اسی وجہ سے ہے۔ شاہ عالم کو حضرت شاہیہ بھی کہتے ہیں۔

ج - وہ کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ جیساکہ ان کی کتاب دین المریدین میں "رباعی للمصنف" کے تحت یہ رباعی درج ہوئی ہے:

صوفی نہ خیال کشف وسطح وطامات ‏ ‏ ‏ در چلہ نشستن از برای طامات
مارا نبود مراد از خلوت و ذکر ‏ ‏ ‏ جز جلوۂ شاہ دبر محمد صلوات[1]

تصانیف | اب تک اس مصنف کی حسب ذیل چار تصانیف سامنے آئی ہیں:

۱- چہل حکایت ۲- دین المریدین ۳- سوال وجواب ۴- احصار الاسمار۔

اول الذکر دو تصانیف کا مطالعہ راقم الحروف نے کیا ہے اور انہی کا حاصلِ مطالعہ یہاں پیش کرنا مقصود ہے باقی موخر الذکر دو کتابوں کا محض تعارف کیا جائے گا۔

چہل حکایت | اس کا مخطوطہ ۱۹۸۳ء میں حکیم سید ظہور اشرف دہلوی، کراچی کے ذاتی کتب خانے میں دیکھا تھا۔[۲۳] یہ چھوٹی تقطیع (۹ سطور فی صفحہ) کا اڑتالیس[۲۴] اوراق پر مبنی ہے جو روح اللہ بن شیخ منور بن شیخ محمد... زاہدی میرٹھی ثم ہانسوی ساکن صوبہ گجرات نے جمادی الاول ۱۱۳۳ھ میں کسی کاتب سے اپنے لیے کتابت کروایا تھا۔ روح اللہ مہاراجہ (اجیت) سنگھ اور نواب (ناہو) خان کا ملازم رہا ہے۔ نسخے کا پہلا ورق مفقود ہو چکا ہے اور پہلے سترہ اوراق اس قدر کرم خوردہ ہیں کہ بعض جملے اور الفاظ اب پڑھے نہیں جاتے اور ضایع ہو چکے ہیں۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ یہ نادر نسخہ مکمل طور پر ضایع ہو جائے گا۔ راقم الحروف نے فوراً اس کی ایک دستی نقل تیار کر لی اور آج دس سال بعد جب اس کتاب کے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں تو یہی نقل پیشِ نظر ہے۔

محتویات | چہل حکایت سید محمد عرف شاہ منجھن ملقب بہ شاہ عالم گجراتی (م ۸۸۰ھ) کے خوارق و کرامات پر مشتمل ہے۔ شاہ عالم سید برہان الدین عبداللہ ملقب بہ قطب عالم گجراتی (م ۸۵۷ھ) کے فرزند اور شیخ احمد کھٹو کے تربیت یافتہ تھے؛ ان کا مزار محلہ رسول آباد احمد آباد میں ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں شاہ عالم کے بارے میں لکھا ہے "خوارق عادات از وی بسیار بوجود می آمد"[۲۵] زیر نظر کتاب میں ان کے چالیس خوارق از ولادت تا وفات بہ عنوان "حکایت"

درج ہوئے ہیں۔ اسی مناسبت سے مصنف نے اسے چہل حکایت کا نام دیا ہے۔

ماخذ | مصنف نے مقدمہ میں لکھا ہے: "این رسالہ مسمّٰی بہ چہل حکایت در مناقب صاحب الولایۃ العظمٰی و وارث الکرامۃ الکبریٰ سید محمد بن عبداللہ الملقب بہ شاہ عالم ... چنانکہ از ثقات مسموع شد نوشتہ آمد"۔ ان حکایت کے راویوں میں شاہ عالم کے بلاواسطہ اور بالواسطہ مریدین شامل ہیں اور مصنف نے اکثر حکایات کے راویوں کے نام اور ان کی مروی حکایتوں کی تعداد لکھی ہے ملاحظہ ہو:

قاضی کبیرالدین محمد	۵	ملک محمد بن دولت خواہ	۹
ملک محمد سلاح دار شاہ عالم	۱۱-۱۲-۱۳	ملک اسحاق	۱۴
امانت الملک بن فضل اللہ بن قاضی بڈھ	۱۵	سید حیدر... عبداللطیف مخاطب داور الملک غازی	۱۷
ملک پیر محمد بن قاضی اسحاق	۱۸	قاضی عمادالدین	۱۹، ۲۰
ملک حاتم بن عالم	۲۱	شیخ محمود واعظ المعروف شیخ چکناں	۲۲
ملک ابو محمد	۲۳	ملک میراں جیو	۲۴
کبیر خاں بن احمد خاں	۲۵	لعل ترہ داری	۲۶
میر سید کبیر	۲۷	کبیرالملک بن عمادالملک	۲۸
ملک... معین الدین بن مولانا حسین بن ہارون منطقی	۲۹	میر سید صدرالدین بھکری	۳۰
شیخ جیو صاحب سجادۂ حضرت قطبیہ	۳۲	شمس الاتقیا شیخ قطب الدین محمود	۳۱، ۳۳، ۳۷
امیر سید خوند میر بن سید خان	۳۴	فتح خان بن نظام خان	۳۵
ملک محمد	۳۶	سید بڈھا دیپال پوری	۳۸
شیخ فضل اللہ کاشانی	۳۹	سلطان الواعظین شیخ غزنی	۴۰

چہل حکایت کی اہمیت بنیادی طور پر یہ نویں صدی ہجری کے ایک بزرگ کے خوارق و کرامات کا تذکرہ ہے مگر بین السطور اس میں بہت سے تاریخی، معاشرتی اور علمی نکات بھی بیان ہو گئے ہیں، مثلاً پٹن (ہند) میں مولانا علی شیر کے مدرسے کا ذکر (حکایت ۲) ملک... معین الدین بن مولانا حسین بن ہارون مشہور بہ منطقی مولفِ رسالہ "فصوص" (در علم کلام و منطق) کا اپنا یہ رسالہ لے کر شاہ عالم کی خدمت میں حاضر ہونا (حکایت ۲۹) اور ملک دولت شاہ جلوانی جامع "کنوز محمدی" کا تذکرہ (حکایت ۳۳)

برصغیر پاک و ہند کے صوفیہ کے ملفوظات اور مناقب پر مشتمل فارسی کتب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ ان میں صوفیہ کی زبان سے نکلے ہوئے مقامی زبانوں کے جملے بھی مل جاتے ہیں جن کا مطالعہ اردو زبان کی تکوین و تشکیل کے لیے بے حد ناگزیر ہے[۵۳]۔ چہل حکایت میں گجراتی لہجے کے بعض الفاظ اور جملے موجود ہیں مثلاً:

۱۔ فرمودند میاں منجھا برو۔ فرزند میانہ را بہ لغت گجراتی اچھا منجھلا گویند۔ (حکایت ۸)

۲۔ خدای تعالی ترا بہ من بخشید۔ بعد ازین اورا اقتدریا بگو (حکایت ۱۳)

۳۔ شاہ عالم ایشان را در حجرۂ مبارک خود بر داشتہ بُردند بزبان گجراتی مناجات فرمودند کہ راجن بگرونی بدل بگمرنا[۵۴] (حکایت ۸)

۴۔ قاضی نجم الدین بنبانی بر یکی از مقربان سلطان محمود بیگرہ حد شرعی زد و بر مزاج سلطان گران آمد، بہ قاضی گفت: نیچی بیری سب کوئی جھورے[۵۵]۔ یعنی درخت کنار کہ پست است دست ہمہ بر و می رسد، شما بر زیر دستان حکومت می نمائید چرا بہ باپ جیو یعنی شاہ عالم امر معروف و نہی منکر نمی کنید (حکایت ۱۶)

۵۔ بزبان گجراتی مناجات کردند کہ راجن جو تجھ تھیں ہوں روٹھا تو مجھ سادے تومانوں (کذا) یعنی آقا و پادشاہا... تو رنجیدم مگر آنکہ خود خشنود سازی (حکایت ۴)

علاوہ ازین بعض مفرد الفاظ مثلاً دکھن (حکایت ۱۷) پالکی (حکایت ۲۱) کٹاری (حکایت ۲۵) اور کھر بھل (حکایت ۳۴) بھی استعمال ہوئے ہیں۔

چہل حکایت شاہ عالم کے حالات و مناقب پر ایسا ماخذ ہے جسے ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا۔

زین المریدین محمد بن جلال شاہی رضوی کی اس تصنیف کا مخطوطہ کتابخانۂ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد میں بہ ذیل شمارہ ۱۹۶ محفوظ ہے[۵۶]۔ یہ ۶۲ صفحات پر مشتمل ہے اور نظر علی نے ۴ رجب ۱۲۶۵ھ کو ملتان میں کتابت کیا۔

راقم السطور نے یہ نسخہ ۱۹۹۲ء میں دیکھا جو صحیح و سالم حالت میں ہے۔

محتویات یہ کتاب سالکوں اور مریدوں کے لیے ایک اخلاقی اور نظریاتی دستور العمل ہے۔ یعنی راہ سلوک میں قدم رکھنے والے مبتدیوں کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ مصنف نے مقدمے میں لکھا ہے کہ اس نے یہ کتاب حضرت سید محمد گیسو دراز کی تصنیف "خاتمہ"[۵۷] (جو در حقیقت ابو النجیب عبد القاہر سہروردی کی تصنیف آداب المریدین کا تکملہ ہے) کے طرز و انداز پر لکھی ہے جو شاہ عالم گجراتی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے[۵۸]۔

اہمیت جیسا کہ ہم نے لکھا یہ کتاب بنیادی طور پر سالکوں کے لیے دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں بعض اہم اور دلچسپ "احکام" بیان ہوئے ہیں۔ علمی نقطۂ نظر سے وہ بے حد اہم ہیں جن میں سفارش کی گئی ہے کہ سالک کون سی کتب پڑھنے سے

احتراز کرے اور کون سی کتابیں پڑھے۔ مصنف نے مرشد کی اجازت کے بغیر وجودی صوفیہ کی تصانیف پڑھنے سے منع کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "ترا باید کہ بی اذن پیر گرد مطالعہ کتب صوفیۂ وجودیہ نگردی، بسیاری را دیدہ شد کہ بہ مطالعۂ سخنان این طایفہ خرسند شدند و بہ آن تسکین ایشان شد و بر ہمان قرار ماندند، تصدیق معانی و تحقیق الفاظ آن را عین مقصود و محض توحید تصور کردند و دانستند کہ ھرچہ ہست ہمین است"[۱۰] ایک اور جگہ پھر تاکید کرتا ہے: "در ابتدا از نظر در کتب صوفیہ وجودیہ بجد محترز باشی، باید کہ مطالعہ منہاج العابدین[۱۱] و انیس التائبین[۱۲] و کشف المحجوب و خاتمۃ الآداب[۱۳] و امثال این از کتب مفیدہ لازم وقت خود سازی و مصباح الہدایۃ[۱۴] و مرصاد العباد[۱۵] و ہر چند کہ از رمز و غمز حقائق خالی نیستند اما در تحسین (کذا: تحصیل) ادب .... دخلی عظیم دارند"[۱۶]

مصنف مریدوں کو عربی زبان سمجھنے کی تلقین کرتے ہوئے لکھتا ہے: "در تعلم چندان کوشی کہ سخن عربی را فہم کنی و از کتب عربیۂ قوم قوت القلوب و احیاء علوم و عوارف المعارف و تعرف مضمون درست بیرون آری و اعراب ادعیہ و اوراد صحیح خوانی و در آشنای تلاوت معانی الفاظ قرآن را حدیث نفس گردانی و ہر روز قدری از سلوک سلف و سیر سلف صالح رضوان اللہ تعالیٰ علیہم مطالعہ کنی"[۱۷]

ان مریدوں کے لیے جن کا دل مراقبے سے بھاگتا ہے اور پراگندہ رہتا ہے، مصنف نے شیخ سعدی، امیر خسرو اور حافظ کے دواوین کا مطالعہ تجویز کیا ہے، وہ کہتا ہے: "اگر چنین اتفاق افتد کہ دلت از مراقبہ رمیدہ است و ہیچ وجہ توجہی درست دست نمی دہد بہ دیوان شیخ سعدی و امیر خسرو و نظری اندازی و بہ صحبت

این سہروردی و چشتی از شعرای دیگر قناعت کنی و از ہر جا کہ بیان عشق و محبتی یابی و حکایت وفای و استقامتی شنوی مثل قصۂ لیلیٰ مجنون گوش نہی و دیوان حافظ نیز فصلی از ہمین بایست"[۱۸]

اس کتاب میں بھی شاہ عالم گجراتی کے بعض واقعات اور ان کے مریدوں کا تذکرہ ہے مثلاً حضرت گنج گیر گنج بخش (م ۸۴۹ھ = شہ عالم محمد را بقا باد) کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھانا[۱۹]، سلطان غزنی شاہی کا سفر سلوک اور شاہ عالم سے تعلق[۲۰]، میاں مخدوم خلیفۂ شاہ عالم کا تذکرہ[۲۱] وغیرہ۔

ہندی فقرے بھی نقل ہوئے ہیں مثلاً

شیخ محمد فرزند قاضی العالم شاہی می فرمودند: جو جوارے گا تو جمارے گا، یعنی او تعالیٰ اگر ترا زندہ خواہد داشت گرسنہ نخواہد گذاشت۔

مصنف نے ہندی شعر اور ضرب المثل بھی نقل کی ہے[۲۲]

رسالۂ سوال و جواب | اس کا مخطوطہ ذخیرۂ آذر دانشگاہ پنجاب لاہور میں بہ شمارہ ۱۲۵۔ ۱۱ موجود ہے۔ یہ رسالہ ایک اور مجموعۂ رسائل میں مجلد ہے اسے راقم الحروف نہیں دیکھ سکا۔ عزیز محترم خضر نوشاہی صاحب نے دیکھا ہے۔ اور اس کا احوال یوں لکھا ہے[۲۳]:

"ذیقعدہ ۱۰۴۲ھ کو امیر کبیر سید بہوہ کی طرف سے محمد بن جلال شاہی رضوی کی طرف سے قاصد پہنچا جس نے امیر کا ایک خط انہیں دیا۔ اس خط میں سولہ (۱۶) سوالات کے جوابات طلب کیے گئے تھے، بعض سوالات یہ ہیں:

۱۔ حضرت علیؓ سے شاہ عالم گجراتی تک پشت در پشت بزرگوں کے نام تاریخہائے ولادت و وفات۔

۲۔ سید جلال اعظم کس سال اُچ پہنچے ؟

۳۔ سید جلال الدین اعظم نے غوث العالم مخدوم شیخ بہاء الدین کی صحبت میں کتنے سال گذارے ؟

۴۔ حضرت مخدوم جہانیاں کتنی بار مکہ معظمہ تشریف لے گئے ؟

۵۔ اس قطب کا کیا نام ہے جس نے حضرت مخدوم جہانیاں کے حالات پر رسالہ لکھا؟

۱۰۔ (مخدوم جہانیاں جہانگشت کے ملفوظات) جامع العلوم میں لکھا ہے کہ کھانے پینے کی بعض اشیا جو از روے شریعت حرام ہیں بعض اوقات خدا کی طرف سے (مخدوم جہانیاں پر) حلال ہو جاتی تھیں، اس بات کی کیا توجیہ ہے ؟

۱۶۔ شیخ احمد سرہندی نے بعض باتیں ادب سے دور تحریر کی ہیں ان کی کیا توجیہ کی جائے گی ؟[۲۴]

محمد بن جلال نے ان سوالات کے جوابات لکھے ہیں۔ سبھی سوال اہم ہیں اور بالخصوص مخدوم جہانیاں جہانگشت اُچی (م ۷۸۵ھ) کے حالات کے سلسلے میں مفید ہیں۔ آخری سوال جو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (م ۱۰۳۴ھ) سے متعلق ہے اس نقطۂ نظر سے اہم ہے کہ حضرت مجدد کے بعض نظریات اور مقامات سے اختلاف کا جو سلسلہ ان کی زندگی ہی میں چل نکلا تھا یہ بھی تقریباً اسی سلسلے کی کڑی ہے اور ایک معاصرانہ رائے ہے۔ چونکہ اصل رسالہ راقم السطور کے پیش نظر نہیں ہے اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ سائل نے کن باتوں کو "از ادب دور" اور "سخن ہائے فضول" سمجھا ہے اور محمد بن جلال نے اس کا کیا جواب دیا ہے۔ امید ہے ہمارے فاضل دوست جناب محمد اقبال مجددی اس کا تعاقب کریں گے۔

احصاء الاسماء | اس کا مخطوطہ ۷۶ اوراق پر مشتمل عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک (ہند) میں ہے۔ مصنف نے میر حسین میبدی کی کتاب فواتح وغیرہ سے اقتباس کر کے اسمائے حسنیٰ کی تفصیل مع خواص و فضائل و معارف بیان کی ہے۔[۲۵]

حواشی

۱؎ دین المریدین، قلمی، گنج بخش، اسلام آباد، شمارہ ۱۹۶۱، ص ۱۰۔ ۲؎ یہ کتب خانہ ان کے گھر ۱۸۷ ایف، بلاک ۲، سوسائٹی میں موجود تھا۔ تقریباً ایک سو مخطوطات کی فہرست میں نے تیار کی تھی۔ زیادہ تر طبی کتب تھیں۔ حکیم صاحب یہ تمام مخطوطات اپنے سینے کے ساتھ لگا کر ہندوستان سے ہجرت کے وقت اپنے ساتھ لائے تھے اور جیسے تیسے اب تک سنبھالے ہوئے تھے مگر حکیم صاحب کی پیرانہ سالی اور اخلاف کی عدم دلچسپی کے باعث یہ ذخیرہ تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔ ایک الماری صرف متفرق قلمی اوراق سے بھری پڑی تھی جو کتابوں سے الگ ہو چکے تھے۔ ایسے کتنے ہی نوادر ہماری حکومتوں کی غفلت کے باعث ضایع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں ۳؎ عبدالحق دہلوی، اخبار الاخیار، عکسی اشاعت گمبٹ ضلع خیرپور، ۱۶۱-۱۶۲، نیز دیکھئے محمد غوثی شطاری مانڈوی، گلزار ابرار (اردو ترجمہ اذکار ابرار از فضل احمد جیوری) عکسی اشاعت، لاہور ۱۳۹۵ھ، ص ۱۶۰۔ ۴؎ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو، جلد اول میں ایسے کئی نمونے پیش کیے ہیں ۵؎ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، طبع لاہور، ۱۹۷۵ء، ج ۱ ص ۹۷، یہی جملہ بحوالہ خاتمہ مرآۃ احمدی (بعد از ۱۱۷۴ھ) ص ۴۰ درج ہوا ہے ۶؎ تاریخ ادب اردو ج ۱ ص ۹۸ میں یہ جملہ بحوالہ مرآۃ سکندری (تصنیف ۱۰۲۰ھ) ص ۱۱۱ نقل ہوا ہے ۷؎ احمد منزوی، فہرست نسخہ ہای خطی کتابخانہ گنج بخش، طبع اسلام آباد، ج ۲ ص ۹۲۴ میں پہلی بار یہ نسخہ متعارف ہوا۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ احمد منزوی نے فہرست

مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان ج ۳ ص ۳۴۶۳ اور ج ۱۱ ص ۸۳۳ پر محمد بن جلال
شاہی کو نویں صدی ہجری کی شخصیت بتایا ہے جو سراسر غلط ہے حالانکہ ج ۱۱ ص ۸۹۴ پر وہ محمد بن
جلال کی تصنیف رسالہ سوال و جواب کا سال تالیف ۱۰۴۲ھ لکھتے ہیں ۸؎ خاتمۂ حضرت
گیسو دراز باہتمام سید عطا حسین، حیدرآباد دکن سے شایع ہو چکا ہے ۹؎ "این چند کلمہ برسبیل
خاتمہ کہ آخر مصنفات قدوۃ السادات خدمت خواجہ صاحب راز خاتم خواجگان چشت امیر
سید محمد گیسو دراز است و حضرت خاتم المحبوبین سید محمد بن عبد اللہ الملقب بہ شاہ عالم
من عند اللہ آن را با خود می داشتند، از خامۂ خام بیرون داد و دین المریدین نام نہاد" مقدمۂ
دین المریدین، خطی، گنج بخش ۱۰؎ دین المریدین، ص ۲۱-۲۲ ۱۱؎ امام غزالی کی تصنیف ہے۔
۱۲؎ شیخ احمد جام زندہ پیل کی تصنیف ہے۔ تہران سے طبع ہو چکی ہے ۱۳؎ مراد گیسو دراز کا
خاتمہ آداب المریدین ہے ۱۴؎ عزیز الدین محمود نطنزی (م ۷۳۵ھ) کی تصنیف ہے تہران سے
طبع ہو چکی ہے ۱۵؎ نجم الدین دایہ رازی (م ۶۵۴ھ) کی تصنیف ہے۔ تہران سے چھپ چکی ہے
۱۶؎ دین المریدین، ص ۶۰ ۱۷؎ ایضاً ص ۱۷-۱۸ ۱۸؎ ایضاً ص ۴۸-۴۹ ۱۹؎ ایضاً ص ۱۵-۱۶
۲۰؎ ایضاً ص ۲۳-۲۴ ۲۱؎ ایضاً ص ۳۲ ۲۲؎ ایضاً ص ۴۶، ۵۲ ۲۳؎ خضر عباسی نوشاہی
فہرست نسخہ ہای خطی فارسی کتابخانہ دانشگاہ پنجاب لاہور، گنجینۂ آذر، طبع لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۵۴
۲۴؎ سائل کی اصل عبارت یہ ہے: "احوال میاں شیخ احمد سرہندی کہ در سلسلہ
نقشبندیہ بودند بہ سمع عالی رسیدہ خواہد بود۔ بعضی حرف از ادب دور و
سخن ہای فضول در تسوید کتابت در آوردہ اند ... بہ چہ وجہ نوشتہ باشد"؟
۲۵؎ محمد عمران خان، خزینۃ المخطوطات، طبع ٹونک، ۱۹۸۴ء، ج ۳
ص ۶۸۔

شیخ علی اصغر قنوجی کی چند دستیاب شدہ تصنیفات

از ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی

ماہ اگست کے معارف میں جناب محمد عارف اعظمی عمری کا ایک گراں قدر مقالہ
بعنوان "بارہویں صدی ہجری کے ڈھائی درجن مفسرین"۔ مولانا شیخ غلام نقشبند
لکھنویؒ اور شیخ علی اصغر قنوجیؒ نظر سے گذرا۔ وہ اس کاوش پر تحسین و تشکر کے
سزاوار ہیں۔ شیخ علی اصغر قنوجی کے حال میں انھوں نے درست لکھا کہ ان کا کوئی
شعری مجموعہ دستیاب نہیں ہے۔ پروفیسر محمد سالم قدوائی صدر شعبۂ اسلامیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھی صرف تفسیر سے متعلق ان کی تصنیف ثواقب التنزیل
فی اثارۃ التاویل کا پتہ چل سکا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں قنوجی اور مولانا حکیم سید
عبد الحئی صاحبان نے بھی ان کی بقیہ تصانیف کے صرف اسما پر اکتفا کی ہے۔ ڈاکٹر
زبید احمد مرحوم نے بھی اپنی تحقیقی کاوش "THE CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC LITERATURE"
میں ان کی کسی تصنیف
کی موجودگی کا کسی لائبریری میں تذکرہ نہیں کیا۔ حسن اتفاق سے راقم الحروف کو
قنوجی کی چھ تصانیف کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا ہے۔ انکے یہ چھ مصنفات
کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں محفوظ ہیں۔ قارئین
معارف کے ملاحظہ کے لیے یہ چند سطور قلم بند کی جارہی ہیں۔

شیخ علی اصغر قنوجی (م ۱۱۴۰ھ/۲۸-۱۷۲۷ء) کی تصنیف جوامع الکلم شرح فصوص الحکم کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔

۱۔ تبصرۃ المعراج :- اس مخطوطہ میں کل ۴۸ صفحات ہیں۔ ہر صفحہ میں سترہ سطریں ہیں۔ خط نستعلیق وشکست ہے کاتب کا نام درج نہیں ہے مگر پہلے ہی صفحہ پر عبدالباسط بن رستم علی بن شیخ علی اصغر صدیقی قنوجی کی مہر ہے جس کے نیچے ان ہی کی تحریر ہے

المالک ھو اللہ سبحانہ لکنہ بفضلہ اعطی التصرف لعبدہ الضعیف عبدالباسط بن رستم علی بن علی اصغر القنوجی۔

ابتدا اس طرح کی ہے۔

سبحان من ستر الحقیقۃ الکاملۃ باظہار الخصوصیۃ الشاملۃ ....

حمد وصلوٰۃ کے بعد اپنے شیخ طریقت حضرت شاہ پیر محمد لکھنویؒ کی مدح ومنقبت کی ہے۔

اس کے بعد رسالہ کی غرض وغایت، وجہ تسمیہ، اس کے محتویات ومشمولات کے بیان کے بعد سالک کے لیے لازمی امور کا تذکرہ ہے۔ بعد ازاں اخذ فیض، تشکر، مقام توبہ، صبر وزہد، بھوک کے فوائد، تواضع، توکل، رضا، محبت، حیا، شوق، انس، خوف، رجاء، فقر، وصل اور دوسرے مقامات وکیفیات کا ذکر کرنے کے بعد سالک کو راہ سلوک اور کرامات کے مقام پر پہنچنے پر جو شیطانی وسوسے اور خیالات آتے ہیں ان کا بیان ہے آخری عبارت یہ ہے:

ھذا ما تیسر لنا بمقتضی الحال ولم یمل علی نفسی فیہ الی فتق المقال

لئلا یقتضی الی الملال .... أسئلہ ان ینفعنا وایاک بہ فانہ الیہ المرجع والمآب۔

۲۔ اللطائف العلیہ فی المعارف الالٰہیہ :- یہ مخطوطہ دوسو بائیس (۲۲۲) صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں۔ صفحہ اول پر عبدالباسط قنوجی کی عبارت درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مخطوطہ ان کی ملک رہا ہے۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ یہ نسخہ بخط مولف ہے۔ صفحہ اول پر ۱۱۳۷ھ مرقوم ہے۔ یہ تصنیف شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ (م ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) کی مشہور زمانہ، معرکۃ الآرا تصنیف "فصوص الحکم" کے طرز پر ہے۔ یہ کتاب چار ابواب اور ایک مقدمہ وخاتمہ پر مشتمل ہے۔ ابتدا اس طرح ہے:

الحمد للہ الذی خلقکم وما تعملون عالم الغیب والشہادۃ فتعالی عما یشرکون بہ ......

مقدمہ میں سالکین کے لیے مقامات سلوک اور احوال کے سلسلہ میں جن رموز ونکات اور تنبیہات کی ضرورت ہوتی ہے ان کا بیان ہے۔ پہلے باب میں وجود باری اور اس سے متعلق مباحث کا بیان ہے دوسرا باب ایجاد عالم کے سلسلہ میں اور تیسرا و چوتھا تنزلات وتنزہات کے سلسلہ میں ہیں۔ تیسرے اور چوتھے باب کو بھی تقسیم کیا ہے مثلاً تیسرے باب کا پہلا حصہ تنزلات کے وجودی مراتب کے بارے میں اور دوسرا وجود امکانی کے مراتب کے سلسلہ میں ہیں۔ خاتمہ کتاب میں ان تمام "لطائف" کا بیان ہے جنکا تعلق "نشأۃ آخرویۃ" سے ہے۔

کتاب کی آخری عبارت یہ ہے:

احیانا اللہ علی ملتھم واماتنا علی سیرتھم واحشرنا فی زمرتھم

واجعلنا منھم ومعھم وممن احبھم واتبعھم۔

۳۔ القصیدۃ النعتیہ :۔ یہ عربی نعتیہ قصیدہ نواسی اشعار پر مشتمل ہے۔ جابجا فارسی میں حواشی بھی ہیں۔ صفحہ اول پر بالترتیب تین مہریں عبدالباسط بن رستم علی قنوجی' رستم علی بن علی اصغر قنوجی' ۱۱۳۱ھ' علی اصغر بن عبدالصمد قنوجی ۱۱۰۱ھ ہیں۔ چوتھی مہر "یا باسط" ہے اس کے نیچے "مالک ایں کتاب عبدالباسط" لکھا ہے نیز عبدالباسط قنوجی کی تحریر ہے "نسخۂ قصائد تصنیف ملا علی اصغر قنوجی" اس تحریر کے زیریں حسب سابق یہ عبارت مرقوم ہے " المالک ھو اللہ سبحانہ لکنہ بفضلہ ...."

قصیدہ کے ابتدائی اشعار یہ ہیں :

یا مظہر الاسم الاتم یا مصدر لوصف الاسم　　ترجی برأفتک الھدی تمحی برحمتک الظلم

بیدیک اسقاط التعب ولدیک منح اللذب　　لبیک من اھل العرب سعدیک من اھل العجم

انت النبی المصطفیٰؐ انت الامین المقتدی　　بدر الدجی صدر العلی لیث الوغی غیث الکرم

آخری اشعار یہ ہیں :

انوار اعلام الھدی ایۃ تھتدی بجنابھم　　کل عرانین العرب کل صنادید العجم

کانوا بحار للفضائل والمکارم جمۃ　　استخرجت منھا اللآلی الحقایق والحکم

۴۔ القصیدۃ المھیمنیۃ فی النفحۃ المحمدیہ :۔ اکسٹھ صفحات پر مشتمل اس قصیدہ میں ایک سو تراسی اشعار ہیں۔ حواشی پر ان اشعار کے مشکل اشعار کی تشریح و توضیح ہے۔ اس قصیدہ کا خط بھی مذکورہ بالا قصیدہ جیسا ہے۔ اشعار

تصوف کے رنگ میں ہیں۔ ان پر لکھے ہوئے حواشی عربی میں ہیں ؛

تعف خلیلی بالمطایانا و تلقاء الحمیٰ　　ان تری فیھا القباب الخمس عسیٰ لعلھا

ان وجدت الوقت بین من حقائق قلبیہ　　بالتادب فی مقام العطف من حسن الادا

فی الحقیقۃ لیس لی من عاذل فی حبھا　　انھا معشوقۃ کالشمس فی بسط الضیا

نعتیہ اشعار کے بعد عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خیر القرون ہونے اور صحابہ کرامؓ کے فضائل و مناقب کا بیان ہے :

اسعد الازمان فی الدنیا قرون الانبیاء　　سیما القرن الذی فیہ محمد مصطفیٰؐ

حبذا عھد الصحابۃ انھم خیر الوریٰ　　حبذا من کان فی عھد النبی المصطفیٰؐ

آخری شعر یہ ہے :

قال اصحابی لکم مثل النجوم بایھم　　اقتدیتم اھتدیتم کلھم عین الھدیٰ

۵۔ ایک تیسرا قصیدہ اسی ضمن میں ایک سو اٹھا اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ مذکورہ بالا دونوں قصائد کے ساتھ مجلد ہے۔ تینوں قصائد کا خط یکساں اور نستعلیق ہے۔ قیاس یہی ہے کہ یہ نسخہ بھی بخط شاعر (مصنف) ہے۔

اشعار میں اخلاص و نیاز مندی' تصوف کے حقائق و معارف' رموز و نکات' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں نعتیہ اشعار' عشق و محبت رسولؐ جو تصوف اور ارباب تصوف کے لیے لابدی ہیں۔ ان سب کا بیان ہے۔ حاشیہ پر جابجا مشکل الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح و توضیح بھی کی ہے۔

ابتدائی اشعار یہ ہیں ؛

احمد اللہ الموفق للمحبۃ والرضا　　احمد اللہ المقدس وجھہ مافی القضا

الحکیم المظہر الاسما بو جہ اقتضیٰ　　　القدیر الواھب الاشیاء ما فی عینھا

لا یودی حمدہ التشبیہ والتنزیہ بل　　　حمدہ ما قال خیر الخلق لا احصی ثنا

بعض اشعار پر حواشی بھی لکھے ہیں :

قصیدہ کا یہ آخری شعر سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے :

صلوا یا قومنا صلوا علی خیر الوریٰ　　　رحمۃ للعلمین ماجاء المصطفیٰ

۲۔ النفائس العلیۃ فی کشف استار المھیمنیۃ :۔ یہ "القصیدۃ المھیمنیہ فی النعتۃ المحمدیۃ" کی شرح ہے جو ایکسو چونتیس (۱۳۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اپنے بعض اشعار کی شرح بہت تفصیل و بسط سے کی ہے اور بعض اشعار میں اختصار کو پیش نظر رکھا ہے۔ صرف مطلع کی شرح تین صفحات پر مشتمل ہے۔ مخطوطہ بخط نستعلیق و شکست ہے۔

صفحہ اول پر حسب سابق ۳ مہریں ہیں۔ عبد الباسط قنوجی کی مہر کے نیچے ان کی تحریر ہے۔ شرح کی ابتدا اس طرح ہے :

منہ ما بین اُمانظر فی عقد القدیر القضا و ما من دابۃ الا ھو اُخذ بناصیتھا طوبیٰ لمھدی منھم السالکین من خزائنہ الجود والھدیٰ سیما نبینا و رسولنا محمد ن المصطفیٰ المخصوص بقرب قاب قوسین او ادنی ... و بعد فیقول العبد المفتقر الی اللہ الغنی علی اصغر بن عبد الصمد القنوجی البکری الکسمانی الخ

بعض اشعار کی تشریح میں اختصار کو بھی مد نظر رکھا ہے مثلاً صحابہ کرامؓ کے فضائل و مناقب میں آخری دو اشعار کی تشریح اس طرح کی ہے۔

قال اصحابی لکم مثل النجوم بایھم　　　اقتدیتم اھتدیتم کلھم عین الھدیٰ

انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔ مالھدی مصادر کالتقی اطلق علیھم مبالغۃ الخ۔

رسالہ "مخزن" (لاہور)

از جناب جاوید اختر صاحب

گو اردو میں صحافت کا آغاز انیسویں صدی کے ربع اول میں ہوا لیکن نصف اول تک اخباروں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس زمانہ کے اخبار سیاسی کم اور مذہبی و سماجی زیادہ تھے جو مختلف انداز میں معاشرتی اصلاح کر رہے تھے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد صحافت نے کروٹ بدلی۔ ایک طرف غدر کی خونچکاں داستان کا بے باکی کے ساتھ برملا اظہار کیا اور دوسری طرف تحریک آزادی کی چنگاری کو بے خوف و خطر ہوا دی۔ اس سلسلے میں کئی اخبار اور پریس کے مالک گرفتار ہوئے اور انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ بعض کی پھانسی بھی ہوئی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کی اردو صحافت

۱۸۵۷ء کا انقلاب اہل ہند کے لیے خصوصاً مسلمانوں کے لیے ایک دھماکہ ثابت ہوا۔ جس نے جمود و تعطل کو ختم کرکے ان کے ذہنوں کو بیدار کر دیا۔ اس زمانے میں مسلمان ہر اعتبار سے پست، کمزور اور انگریزوں کے معتوب ہو گئے تھے۔ ان کے لیے ترقی کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ لیکن اسی پُر آشوب دور میں سرسید نمودار ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے مختلف طریقہ کار اپنائے۔ تعلیمی کمیٹیوں کا انعقاد، مدارس کھولنے کا اہتمام، سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی بنیاد اور "تہذیب الاخلاق" کا اجرا وغیرہ۔ "تہذیب الاخلاق"

کا مقصد قوم کی مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی اصلاح تھا، اس کی بدولت اردو میں علمی و ادبی صحافت کی بنیاد پڑی اور اس کے نثری سرمایہ میں وسعت و تنوع پیدا ہوا۔

مزاحیہ صحافت نے "اودھ پنچ" (ہفتہ وار۔ اجراء ۱۶ جولائی ۱۸۷۷ء بمقام لکھنؤ) کی شکل میں آنکھ کھولی۔ اس کے بعد صحافت کی دنیا میں "پنچوں" کا سیلاب امڈ پڑا جس کے ذریعہ طنزیہ و مزاحیہ ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ "اودھ پنچ" کے چھ سال بعد "فتنہ" (ہفتہ وار۔ اجراء ۸ جولائی ۱۸۸۳ء) اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ افقِ صحافت پر طلوع ہوا اور اس نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ "فتنہ" کی تقلید میں ایک بار پھر مزاحیہ اخباروں کا دھاما تیز ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے مزاحیہ صحافت کا بڑا رواج ہوگیا۔ نادم سیتاپوری لکھتے ہیں:

> "انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستان بھر میں مزاحیہ اخبارات کی تعداد پچاس سے اوپر پہنچ چکی تھی۔"[۱]

اردو کی علمی و ادبی صحافت میں "تہذیب الاخلاق" کے بعد "دلگداز" (۱۸۸۷ء لکھنؤ) "معارف" (۱۸۹۸ء۔ علی گڑھ تم پانی پت) اور "ادیب" (۱۸۹۹ء۔ فیروزآباد) نے آگے چل کر وسعت و اضافہ کیا۔ ان رسائل نے خالص علم و ادب کی ترویج و اشاعت کی۔ فلسفہ، تاریخ، اخلاق، طب، ادب وغیرہ موضوعات کو اختیار کرکے اردو نثر میں تنوع پیدا کیا۔ لیکن "دلگداز" کے علاوہ سب کی چمک دمک دو چار سال سے زیادہ نہیں رہی۔

مزاحیہ اور علمی و ادبی صحافت کے علاوہ انیسویں صدی کے آخری ربع میں گلدستوں کے اجراء سے شعری ادب میں اضافہ ہوا۔ بڑی تعداد میں گلدستے نکلے۔

دلی۔ آگرہ۔ لکھنؤ کا کیا ذکر ان کے ملحقات سے بھی گلدستے آسمان صحافت پر تاروں کی مانند چمک رہے تھے "تاریخ صحافت اردو" سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں گلدستوں اور طرحی رسالوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد ہوگئی تھی۔

۱۸۶۵ء میں پہلی بار اردو اور ہندی کا تفرقہ شروع ہوا جو بڑھتا ہی گیا اور اس کے نتیجہ میں:-

> "۱۸۹۹ء میں ہندی زبان کے حامی ہندوؤں نے بے شمار دستخطوں کے ساتھ ایک محضرنامے کے ذریعہ اینٹونی میکڈانل سے مطالبہ کیا کہ عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ہندی کو رائج کیا جائے۔ اس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء میں یوپی کی عدالتوں میں ہندی رسم الخط جاری کر دیا۔"[۲]

رسالہ مخزن کے اجرا کا سبب

محسن الملک نے علی گڑھ اور لکھنؤ میں اس کے خلاف احتجاج کیا اور کامیاب جلسے کیے۔ اگست ۱۹۰۰ء میں جب لکھنؤ میں جلسہ منعقد ہوا تو پنجاب کی نمائندگی غلام بھیک نیرنگ، شیخ محمد اقبال اور شیخ عبدالقادر نے کی۔ ان لوگوں نے اردو کی تائید و حمایت میں تقریریں کیں۔ جلسہ کے بعد شیخ عبدالقادر نے لکھنؤ کی سیر کی۔ ان کے اعزاز میں بعض مخصوص نشستیں بھی ہوئیں جن میں بہت سے شعراء نے اظہار تعلی کرتے ہوئے ایسے اشعار کہے جن سے واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان کے اصل مالک اہل دہلی اور اہل لکھنؤ ہی ہیں۔ دوسرے علاقوں کے افراد کی اردو دانی ان ہی سے مستعار ہے۔ شیخ عبدالقادر نے اسے محسوس کرکے لکھنؤ میں ہی یہ فیصلہ کیا کہ ایسا رسالہ جاری کریں جو مذہبی، سیاسی اور ادبی بحثوں اور مناقشوں سے علیحدہ ہوکر

صرف صحت مند اور تعمیری ادب کی ترویج و ترقی کو اپنا اولین فرض سمجھے چنانچہ لاہور واپس آنے کے بعد اس ارادہ کو عملی جامہ پہنایا اور اپریل ۱۹۰۱ء میں "مخزن" نام کا رسالہ اپنی تمام ظاہری و معنوی خوبیوں کے ساتھ آسمانِ صحافت پر طلوع ہوا۔ رسالہ کے نام کی بابت شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں :

"اس رسالہ کا نام انگریزی لفظ "میگزین" کا صحیح ترجمہ ہے اور گو "میگزین" بھی اردو میں سمجھا جاتا ہے مگر جب "میگزین" اصل میں عربی لفظ "مخزن" سے مشتق ہے، تو کیوں ہم "مخزن" کو ان معنوں میں استعمال نہ کریں۔"[۳۳]

مخزن کے اصول و مقاصد

"مخزن" نے بیسویں صدی کے آغاز میں شایع ہونے والے رسائل میں بہت جلد اپنا ممتاز مقام بنا لیا۔ اسکی معتدل ادبی حیثیت نے اہلِ ادب کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ خاص و عام میں مشہور و مقبول ہوگیا۔ دوسرے رسائل کی طرح "مخزن" نے بھی اپنے اصول و ضوابط مرتب کیے اور مقاصد پیش کیے۔ پہلے ہی شمارہ میں "بناوٹ اور سادگی" کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون میں بناوٹ اور تکلف کی سحر کاری میں ملوث سماج پر طنز کرتے ہوئے اس کے نقصانات کی وضاحت کی ہے اور خطرات سے آگاہ کیا ہے۔ ساتھ ہی سر سید اور ان کے رفیقوں کے زیر اثر پیدا ہونے والے منثور و منظوم ادب پاروں کی خوبی و تعریف اور اردو ادب کی جملہ اصناف نثر و نظم میں موجود تصنع اور آورد کی تاریخ و روایت کا احاطہ کرتے ہوئے اس کی ناگفتہ بہ حالت پر افسوس کیا ہے۔ بعد میں لکھتے ہیں :

"ہم آج سادگی کی اصل دلفریبیوں کے قدر دانوں کو صلائے عام دیتے ہیں کہ اگر سادگی اور بناوٹ کی جنگ دیکھنا ہے تو ہمارے پاس آئیں اور "مخزن" کے صفحوں میں دیکھیں۔ بناوٹ کو اپنی قدامت پر ناز ہے اور ہو سکتا ہے اس کو اپنے دلداروں کی تعداد کا گھمنڈ ہے اور بجا ہے مگر سادگی کو اپنی سچائی پر بھروسہ ہے اور درست ہے اور سب سے بڑی تسلی اسے یہ ہے کہ زمانہ کی رفتار اس کے موافق ہے۔ یہ نیا مذاق بہت کچھ "تہذیب الاخلاق" کے نامور ایڈیٹر اور ان کے ہمراہیوں اور "حسن" کے فاضل مضمون نگاروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے .... ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ موجودہ علمی رسالوں کی تعداد میں ایک رسالہ زیادہ کرتے ہوئے اپنا رنگ جہاں تک ممکن ہو سب سے جدا رکھیں۔"[۳۴]

"مخزن" اول تا آخر مذکورہ مقصد کو پورا کرتا رہا، معنوی اعتبار سے رسالہ کی نثر و نظم کے مندرجات میں جو اصلیت اور سادگی ملتی ہے وہ عصری رسائل میں نظر نہیں آتی ہے، باوجود علمی موضوعات مثلاً فلسفہ، اخلاق، سائنس، معاشرت وغیرہ کے اس کی نثر ثقیل الفاظ اور پیچیدہ اسلوب سے معرّا ہوتی تھی۔ عام فہم انداز میں علمی مباحث پیش کرنا "مخزن" کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے شعر و ادب سے لے کر مختلف علوم و فنون کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

"اس رسالہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کے اکثر مضامین اس قدر مشہور و مقبول ہوئے کہ کتاب کی صورت میں شایع ہو کر داخل کورس ہوئے۔"[۳۵]

"مخزن" نے جب بزمِ صحافت میں قدم رکھا تو معاصر اخبارات و رسائل نے اسکا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ "ٹریبیون" (لاہور)، "پیسہ" (لاہور)، "وطن" (لاہور)، سول اینڈ ملٹری نیوز" (لدھیانہ)، "چودھویں صدی" (راولپنڈی)، "اتفاق" (ساڈھورہ)، "اپنچ" (بانکی پور)، "پنجاب گزٹ" (سیالکوٹ)، "شمیم ہند" (جالندھر) "سیالکوٹ پیپر"

(سیالکوٹ) وغیرہ اخبارات نے "مخزن" کی تعریف و توصیف کی۔ ان کے علاوہ معاصر رسائل "دلگداز" (لکھنؤ)، "معارف" (پانی پت)، "زبان" (دہلی)، "جلوۂ محبوب" (حیدرآباد دکن)، "بھارت پرتاپ" (جھجھر) اور انگریزی رسالہ "کائستھ سماچار" (الہ آباد) وغیرہ نے بھی "مخزن" کا استقبال کیا اور ان کے مدیروں نے اپنے اپنے رسالوں میں اس کی خوبیاں بیان کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "مخزن" نے اپنی گوناگوں صفات کی وجہ سے عصری رسائل میں ایک منفرد و ممتاز مقام پیدا کر لیا تھا۔ بہزاد نے لکھا ہے:

"ادیب" (فیروز آباد) کے بعد سب سے اچھا رسالہ لاہور سے شیخ عبدالقادر کی سرپرستی میں "مخزن" نکلا۔ جس نے اپنے مضامین و حسن ترتیب کی وجہ سے بہت جلد ہردلعزیزی و شہرت حاصل کر لی اور جس قدر اشاعت اس رسالہ کی ہوئی۔ ہمارا خیال ہے کہ سوائے "دلگداز" (لکھنؤ) کے اور کسی رسالہ کو آج تک نصیب نہ ہو سکی ہوگی۔"

"مدیر" مخزن" نے رسالہ کے دوسرے شمارہ میں اس کی خصوصیات لکھیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ "مخزن" صرف ایک ادبی رسالہ ہی نہیں تھا بلکہ اس کے بانی اور رفقائے کار اسے تحریک کی شکل دینے میں سعی و محنت کر رہے تھے۔ "مخزن" کی خصوصیات اس کے مدیر کی زبانی ملاحظہ ہوں:

"اول: انگریزی مضمون نگاری کی دلچسپیاں اپنی زبان میں پیدا کرنا مگر ایسی نزاکت سے کہ پرانے مذاق کو ناگوار نہ ہو اور حتی الوسع اردو انشاپردازی کے اصولوں میں کسی سے انحراف نہ ہو۔

دوم:۔ اس کے مضامین بالعموم ایسے ہوں گے جو کسی ایک مذہب و ملت کے مذاق تک محدود نہ ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی دلچسپی کا سامان مہیا کیا جائے گا۔

سوم:۔ فن تقریر و فصاحت جو اس زمانہ میں مغرب میں بہ حیثیت فن سیکھا اور سکھایا جاتا ہے، ہندوستان میں رواج دینا تاکہ ہندوستان کے ایسے مقرر جن کو قدرت نے قوت بیانیہ اور جوش و اثر عطا کیا ہے۔ فصاحت کی نئی معلومات سے فائدہ اٹھائیں۔

چہارم:۔ انگریزی نظموں کے نمونے پر طبع زاد نظمیں، انگریزی نظموں کے بامحاورہ ترجمے، اخلاقی نظمیں اور پرانے رنگ کی نظم کے انتخاب اس میں جمع کیے جائیں گے۔"

ان خصوصیات کو "مخزن" نے ابتدا ہی سے نبھانا شروع کیا اور جب تک شیخ عبدالقادر رسالہ کی پوری نگہداشت کرتے رہے۔ رسالہ کی ترقی و معیار روزافزوں رہا۔ ماہ بہ ماہ خوب سے خوب تر مضامین شایع ہوتے رہے اور وہ اپنے اغراض و مقاصد کو پورا کرتا رہا لیکن تیسری خصوصیت فن تقریر و فصاحت کے مغربی طرز و معیار سے اہل ہند کو متعارف کرانے کے اصول پر وہ ابتدائی تین شماروں کے بعد کاربند نہیں رہا۔

مخزن کے قلمی معاونین

"مخزن" کو اپنے دور کے بہترین ادیبوں اور شاعروں کا تعاون میسر آیا اور اردو ادب کی قدآور شخصیتیں اس سے وابستہ رہیں۔ اقبال، سجاد حیدر یلدرم، ظفر علی خاں، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، داغ دہلوی، جلال، تسلیم، ثاقب، شرر لکھنوی، چکبست لکھنوی، عشرت لکھنوی، سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد،

سلطان حیدر جوشؔ، سید احمد دہلوی، لالہ سری رام، مرزا محمد سعید دہلوی، ناصر نذیر فراقؔ دہلوی، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، مولوی ذکاء اللہ، وحید الدین سلیمؔ پانی پتی، تلوک چند محروم، سرورؔ جہان آبادی، طالبؔ بنارسی، نادرؔ کاکوروی، خوشی محمد ناظرؔ، غلام بھیک نیرنگؔ، شاہ دین ہمایوںؔ، حکیم احمد شجاع، نیاز فتحپوری، سجاد انصاری، حبیب الرحمٰن خاں شروانی، اسمٰعیل میرٹھی، آزادؔ عظیم آبادی، برج موہن دتاتریہ کیفیؔ، یاسؔ یگانہ چنگیزی، قاضی عبد الغفار، مرزا اعجاز حسین، حفیظؔ جونپوری، احسنؔ مارہروی، آغا شاعر قزلباش، تاجورؔ نجیب آبادی، حفیظؔ جالندھری، جلیل قدوائی، فانیؔ بدایونی، حافظ محمود خاں شیرانی، سید امتیاز علی تاجؔ، آغا حشرؔ کشمیری، رشید احمد صدیقی، جوشؔ ملیح آبادی، عبد الحمید عدمؔ، یوسف ظفرؔ، قیوم نظرؔ، میرا جی، حامد علی خاں، میاں بشیر احمد اور شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی وغیرہ نے "مخزن" کو واقعتاً ایک گنج گرانمایہ بنا دیا تھا۔

مخزن کے مختلف دور مخزن کی اشاعت درمیان میں منقطع بھی ہوتی رہی ہے، جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

پہلا دور:۔ اپریل ۱۹۰۱ء تا جنوری ۱۹۲۲ء دوسرا دور:۔ مارچ ۱۹۲۶ء تا دسمبر ۱۹۳۰ء تیسرا دور:۔ جنوری ۱۹۴۹ء تا مئی ۱۹۵۱ء۔

پہلا دور اس کے پہلے دور میں شیخ عبد القادر رسالہ سے وابستہ رہے۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک کا وقفہ چھوڑ کر ۱۹۱۱ء تک انھوں نے اپنا سارا وقت، محنت اور صلاحیت "مخزن" کے لیے وقف کر دی تھی، لیکن ۱۹۱۱ء کے بعد اپنی نجی مصروفیات کے باعث وہ "مخزن" کی جانب زیادہ توجہ نہ دے سکے جس کی وجہ سے پہلے جیسا رسالہ کا معیار برقرار نہ رہ سکا۔ معیار کے لحاظ سے پہلے دور کے مخزن کو تین حصوں میں تقسیم کیا

جا سکتا ہے۔

۱۔ اپریل ۱۹۰۱ء تا دسمبر ۱۹۱۶ء ۲۔ جنوری ۱۹۱۷ء تا اکتوبر ۱۹۲۰ء ۳۔ مئی ۱۹۲۱ء تا جنوری ۱۹۲۲ء۔

ابتدا میں "مخزن" کے ساتھ شیخ عبد القادر کی مستقل وابستگی نے رسالہ کو ادبی صحافت کے عروج پر پہنچا دیا تھا جس کا اعتراف تمام اہل نظر نے کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبد القادر پہلے شمارہ سے لے کر اپنے سفر انگلستان ۱۹۰۴ء تک رسالہ کو خوب سے خوب تر بنانے میں لگے رہے۔ مختلف النوع موضوعات پر مضامین شایع کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ نظم سے زیادہ نثر کی طرف توجہ دیتے تھے۔ رسالہ کا تین چوتھائی حصہ نثر سے مملو ہوتا تھا اور بقیہ منظومات و غزلیات پر مبنی ہوتا تھا۔ حصۂ نظم میں مدیر قدیم و جدید شعراء کی نگارشات بڑے اہتمام سے شایع کرتے۔ اس حصہ میں جہاں ایک طرف اقبالؔ، ظفر علی خاں، غلام بھیک نیرنگؔ، آزادؔ عظیم آبادی، حسرتؔ موہانی، صادق علی خاں، خوشی محمد ناظرؔ، تلوک چند محرومؔ، مرزا اعجاز حسین اور شاہ دین ہمایوںؔ جیسے نظم گو حضرات انگریزی خیالات سے ماخوذ نظمیں اور جدید طبع زاد نظمیں لکھ کر اردو کے شعری ادب میں وسعت و اضافہ کر رہے تھے وہیں دوسری طرف قدیم طرز سخن کے دلدادہ، داغؔ۔ جلالؔ، تسلیمؔ اور سائلؔ وغیرہ اردو غزل کے پر پیچ گیسو سنوارنے اور نکھارنے میں منہمک تھے۔

شیخ عبد القادر ۱۹۰۴ء میں انگلستان جانے لگے تو رسالہ کو شیخ محمد اکرام کے سپرد کر دیا۔ اس سے ادبی حلقہ میں رسالہ سے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور اس کے معیار کے بارے میں اندیشے ظاہر کیے جانے لگے۔ لیکن شیخ محمد اکرام نے لگن

دلچسپی اور محنت کے ساتھ "مخزن" کے گذشتہ معیار کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے بہتر بھی بناتے رہے۔ نثری مضامین کا تنوع بھی قائم رکھا اور ترتیب شاعری بھی باقی رکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر کے عہد ہی میں "مخزن" کی شہرت، مقبولیت اور قدر افزائی نے رسالہ کو ادب کی ایک اعلیٰ منزل پر پہنچا دیا تھا، اسے اپنے دور کے لائق و فائق اہل قلم اور بلند پایہ مصنفین کا قلمی تعاون حاصل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے شیخ عبدالقادر کے انگلستان جانے کے بعد بھی "مخزن" پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

شیخ محمد اکرام نومبر ۱۹۱۱ء میں "مخزن" سے علٰحدہ ہو گئے اور رسالہ کا سارا کام شیخ عبدالقادر نے پھر اپنے ذمہ لے لیا لیکن اپنی مستقل ذاتی مشغولیات کی وجہ سے رسالہ کی ملکیت اور ذمہ داری غلام رسول کو سونپ دی اور صرف مدیر کی حیثیت سے "مخزن" میں کام کرتے رہے مگر پہلے جیسا انہماک نہیں رہا جس کے باعث رسالہ کے معیار پر اثر پڑا۔ بہزاد لکھتے ہیں:

> "شیخ عبدالقادر کی برائے نام ایڈیٹری میں اب بھی بلا پابندی اوقات شایع ہوتا ہے مگر جیسے مبتذل اور ناکارہ مضامین اس میں شایع ہوتے ہیں ان کو دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔"[۴۹]

۱۹۱۵ء میں شیخ عبدالقادر کی حیثیت آنریری ایڈیٹر کی رہی اور اسسٹنٹ ایڈیٹر میر نثار علی شہرت ہوئے (ان کا نام رسالہ کے سرورق پر نہیں چھپتا تھا بلکہ رسالہ کے اندر ان کی تحریروں کے نیچے "اسسٹنٹ ایڈیٹر 'مخزن' درج ہوتا تھا)، انھوں نے رسالہ میں ظاہری تبدیلیاں کیں۔ سائز اور فہرست مضامین کی تبدیلی واضح اور نمایاں تھی۔ معنوی اعتبار سے مضامین میں پہلی جیسی وسعت و تنوع نہیں رہا۔

ہلکے پھلکے نثری مضامین شایع ہوتے تھے اور حصۂ نظم بھی زیادہ بہتر نہیں تھا۔ ادھر شیخ عبدالقادر کی روز افزوں مصروفیات اور "مخزن" سے ان کی بے توجہی نے رسالہ کے ظاہری و معنوی معیار کو نہ صرف ابتر کیا بلکہ تیسرے درجہ کا رسالہ شمار ہونے لگا گویا "مخزن" اب رو بہ انحطاط ہونا شروع ہو گیا۔ خود اداریہ میں رسالہ کی اس کسمپرسی کا اظہار ان الفاظ میں ہوا ہے:

> "یادش بخیر! "مخزن" کا ایک شباب کا زمانہ تھا کہ دنیائے ادب میں اس کی دھوم تھی۔ اردو کے بہی خواہ اس کی دلربائیوں پر فریفتہ نظر آتے تھے۔ ہندوستان کے ناقدالاقران ادیب و شعراء اپنے جواہر نگاریوں سے زینت بخشتے تھے۔ اسکے قدرداں اس کے خیر مقدم کے لیے پلکوں کا فرش کرتے تھے۔ اس کی اشاعت اتنی تھی کہ آج اردو کے کسی مقتدر روزانہ اخبار کی بھی نہیں ہے لیکن آج "مخزن" کی کس مپرسی دیکھنے کے قابل ہے۔"[۵۰]

جنوری ۱۹۱۷ء سے "مخزن" کے جوائنٹ ایڈیٹر تاجور نجیب آبادی ہوئے اور رسالہ کی تمام تر ذمہ داری انہیں کے ہاتھ میں ہو گئی صرف آنریری ایڈیٹر کی حیثیت سے شیخ عبدالقادر کا نام شایع ہوتا تھا۔ اس عہد میں فہرست مضامین کی واضح تبدیلی یہ ہوئی کہ نثر و نظم دونوں کے علٰحدہ علٰحدہ حصے ایک ساتھ شایع ہونے لگے۔ "مخزن" کے سولہ (۱۶) سال کے عرصہ میں یہ ایک نئی تبدیلی تھی جو رسالہ کے ظاہری حسن میں اضافہ اور اسے پہلے جیسا مقبول بنانے میں مفید ثابت نہیں ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ "مخزن" نے اپنی سولہ (۱۶) سال کی مدت میں ظاہری حسن میں، جو کشش و جاذبیت پیدا کی تھی، ناظرین "مخزن" کی ایک بڑی تعداد نے اسے پسند کیا تھا اور

مزاج اس کا عادی ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں تاجور کی مذکورہ تجویز و عمل سود مند ثابت نہ ہوا۔ اس کے علاوہ تاجور نے معنوی تبدیلی بھی کی جس کی وجہ سے نثری حصہ بالخصوص متاثر ہوا۔ حالانکہ یہی وہ حصہ تھا جو "مخزن" کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نوع کی تبدیلی کی دو وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ "مخزن" کے پہلے دور کے نثر نگاروں کی نگارشات انہیں میسر نہ ہوئیں دوسرے شیخ عبدالقادر کی "مخزن" سے مستقل اور مکمل علیحدگی تھی۔ تاجور کے دور میں لاہور کی انجمنوں کی رپورٹیں، مشاعروں کی روداد اور ان کے انتخابات نے "مخزن" کو بہت نقصان پہونچایا جس کی وجہ سے رسالہ کا سارا مقصد فوت ہو گیا اور قارئین "مخزن" کی نظر میں "مخزن" کمتر درجہ کا رسالہ ہو گیا۔ اظہر نعمانی رودولوی نے لکھا ہے:

> "مخزن" جس وقت تک شیخ عبدالقادر کی نگرانی میں نکلا ہندوستان کے اعلیٰ پرچوں میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن جس وقت سے شیخ صاحب اپنی ذاتی مصروفیتوں کے باعث اس سے سبکدوش ہو گئے اس کا وہ اگلا سا رنگ نہیں رہ گیا۔[۹]

مئی ۱۹۳۱ء سے بیدل شاہجہانپوری "مخزن" کو مرتب کرنے لگے، اب شیخ عبدالقادر کا نام سرپرست کی حیثیت سے شایع ہوتا تھا لیکن انہیں براہ راست رسالہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وقتاً فوقتاً مضامین لکھ دیا کرتے تھے۔ بیدل نے تاجور کے طریق سے انحراف کر کے "مخزن" کے دور اول کی ظاہری ترتیب کو اپنایا۔ لیکن علمی، ادبی اور دوسرے موضوعات سے متعلق نثری مضامین کی تعداد بہت کم ہو گئی، اور افسانوی ادب کی تعداد بڑھ گئی۔ بعض طویل افسانے، ڈرامے اور ناول بالاقساط شایع ہونے لگے۔ سعی بلیغ کے باوجود بیدل "مخزن" کو اس کا کھویا ہوا

مقام نہ دلا سکے تاہم تاجور کے عہد سے اسے بہتر ضرور بنا دیا تھا مگر جنوری ۱۹۳۲ء کا شمارہ نکال کر اسے بند کر دیا۔ مخزن کے اس دور کی بابت بھی اہل نظر کی رائے اچھی نہیں ہے۔

دوسرا دور "مخزن" کا دوسرا دور مارچ ۱۹۲۰ء سے دسمبر ۱۹۳۰ء تک محیط ہے۔ اس دور کے روح رواں ابوالاثر حفیظ جالندھری تھے۔ "مخزن" کلی طور پر ان کے ہاتھ میں تھا، شیخ عبدالقادر سے اس کا کوئی بھی تعلق نہ تھا۔ اسے 'مخزن' کا "دور جدید" کہا جاتا ہے۔ رسالہ کا یہ دور اپنے پہلے اور دوسرے دور سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہری تبدیلی مثلاً سائز، کاغذ، طباعت اور رسالہ کے مندرجات وغیرہ کے لحاظ سے منفرد دکھائی دیتا نظر آتا ہے۔ آرٹ سے مزین اشاعتِ تصاویر کا اہتمام ملتا ہے۔ معنوی اعتبار سے رسالہ کے نثری مضامین زیادہ وقیع نہیں ہیں۔ ادب اور تنقید سے متعلق مضامین کا فقدان ہے، افسانوی ادب پر خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ نظموں سے زیادہ غزلیں شایع کی جاتی تھیں اس دور کے مشمولات ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ "مخزن" نے اپنے سابقہ مقاصد کو نظر انداز کر دیا ہے۔

تیسرا دور "مخزن" کے تیسرے دور کا آغاز جنوری ۱۹۴۹ء میں ہوا اور مئی ۱۹۵۱ء کا آخری شمارہ نکلنے کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اس بار شیخ عبدالقادر کی سرپرستی میں حامد علی خاں نے جنوری ۱۹۴۹ء میں "مخزن" کا پہلا شمارہ نکالا۔ رسالہ کی ظاہری ترتیب اپنے دوسرے دور سے مماثل و مشابہ نظر آتی ہے، لیکن رسالہ کے مندرجات کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے، ادب و تنقید

اور افسانوں کے علاوہ بعض مشاہیر پر مضامین کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا جو دیر تک قائم رہا۔ لیکن ان سب کے باوجود رسالہ کے زیادہ صفحات "مخزن المخازن" "تبرکات مخزن"۔ "قارئین"۔ "یاران نکتہ داں" وغیرہ عنوانات کے لیے وقف ہوتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "مخزن" کا مقصد وحید شاید ان کالموں میں سمٹ کر آگیا ہے اور بقیہ نگارشات کا درجہ ثانوی ہے۔

مخزن کے کالم

"مخزن" کے ہر دور کے مستقل کالم بھی دلچسپی اور اہمیت سے خالی نہیں ہیں۔ "کچکول" کے عنوان سے قدیم و جدید شعرائے اردو کے چیدہ اشعار شایع کرنے کا سلسلہ جاری کیا گیا جو اپریل ۱۹۰۱ء سے مارچ ۱۹۰۴ء تک قائم رہا، اسی درمیان پہلی بار نومبر ۱۹۰۲ء سے حصۂ نظم میں "تازہ غزلیں" عنوان کا اضافہ ہوا جس کے تحت معاصر شعراء کا کلام چھپنے لگا۔ مارچ ۱۹۱۷ء سے "ریویوز" کے کالم میں رسائل و کتب پر مختصر تبصرہ کی ابتدا ہوئی، تاجور نے مئی ۱۹۱۷ء سے لاہور کی تین ادبی محفلوں "انجمن ارباب علم"۔ "بزم اردو" اور "بزم احباب" کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں کی روداد اور انتخاب مشاعرہ کا سلسلہ جاری کیا۔ بشیر احمد کی خواہش اور اصرار پر جون ۱۹۱۷ء سے "کچکول" کالم کی تجدید ہوئی۔ جنوری ۱۹۱۹ء سے رسالہ کے پہلے صفحہ پر "تبصرہ" کے عنوان سے ہر شمارہ کے منتخب مضامین نثر و نظم پر مدیر نے مختصر تعارفی نوٹ لکھنا شروع کیا۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء سے جنوری ۱۹۲۰ء تک رسالہ کے آخر میں "محکمۂ احتساب" کالم کے تحت اردو کے عصری اخبارات و رسائل، کتب اور اہل قلم کی نگارشات کا تجزیہ کیا جانے لگا۔

اس طرح مارچ ۱۹۱۷ء سے جنوری ۱۹۲۰ء تک رسالہ کے کالموں میں

جلد جلد تبدیلیاں ہوتی رہیں اور کوئی مستقل صورت پیدا نہیں ہو سکی، کوشش یہ کی گئی کہ ان کالموں کو کوئی نئی شکل دی جائے اور اس کے لیے نئے نئے کالم شروع بھی کیے گئے اور پھر جلد ہی بند بھی ہو گئے۔ پیش کش کے انداز بھی بدلتے رہے۔ جس سے رسالہ کی ظاہری و معنوی صورت میں بھی برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں اور یہ سب کچھ رسالہ کے معیار کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے تھا۔ لیکن شیخ عبدالقادر کی علیحدگی کے بعد "مخزن" کا معیار کم سے کم تر ہو گیا۔ مذکورہ بالا دور کے متعلق حفیظ جالندھری لکھتے ہیں:

> "وہی 'مخزن' تھا اور اسے بلند معیار پر لانے کے لیے اس کے مالک بے دریغ روپیہ صرف کر رہے تھے، لیکن ایڈیٹر کی ناتجربہ کاری اور پھوہڑپنے نے اسے مشاعروں کی رپورٹوں اور انتخابات کا ایک ذلیل و ادنیٰ مجموعہ بنا کر ذوق سلیم کی نگاہوں سے ایسا گرا دیا کہ بعد میں اسے سنبھالنے کی بہتیری کوشش کی گئی اور مولانا بیدل (مرحوم) نے اسے کامیاب بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔"[۱۱]

"مخزن" کے دوسرے دور میں ملا رموزی کے مستقل کالم "شذرات و اشارات" بعد میں "نکات" توجہ طلب ہیں۔ اس کالم کے تحت ملا رموزی مسلمانوں کے عصری مسائل بالخصوص زبان اردو کے ساتھ حکومت اور متعصب ہندوؤں کے سوتیلے برتاؤ کا ذکر بڑے طنزیہ انداز میں کرتے تھے ترمیم و اضافہ کے بعد یہی "نکاتِ رموزی" کے نام سے دو حصوں میں کتابی شکل میں شایع ہوئے۔

حامد علی خاں نے اپنے دور میں "مخزن المخازن" کے ضمن میں "تبرکات مخزن" کے کالم کا آغاز کیا جو زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ "یاران نکتہ داں"۔

"مطبوعات" اور "ایڈیٹر کے نام" وغیرہ کالموں کا بھی سلسلہ جاری کیا۔

مذکورہ تمام تبدیلیوں کے باوجود "مخزن" میں سادگی اول تا آخر نظر آتی ہے، البتہ حفیظ جالندھری نے اپنے دور میں شوخ تصاویر کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ لیکن ظاہری ترتیب میں انھوں نے بھی سادگی کو باقی رکھا۔ رسالہ کا سرورق بالکل سادہ ہوتا تھا "مخزن" کے دور اول کے سرورق پر ہندوستان کا نقشہ ہوتا تھا اور پھر ان شہروں کی نشاندہی کی جاتی تھی جن کی اردو مادری زبان تھی یا جہاں وہ مروج تھی یا سمجھی جاتی تھی، ان تینوں کے لیے تین طرح کے نشان دیے جاتے تھے اور فہرست مضامین کے نیچے سطر کھینچ کر اس کی تفصیل لکھتے تھے۔ نمونہ پیش ہے۔

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے دہلی، لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، بنارس
▯ ان شہروں میں اردو مروج ہے لاہور، پشاور، حیدرآباد دکن
⊖ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے مدراس، بنگلور، بمبئی، کلکتہ، کشمیر

اس کے علاوہ سرورق پر درج ذیل عبارت ہوتی تھی۔ جس سے اس وقت اردو زبان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں"۔

مخزن کے صفحات

"مخزن" ابتدا میں ۴۸ صفحات پر نکلنا شروع ہوا، لیکن جیسے جیسے اس کی مقبولیت بڑھتی گئی اور قارئین مخزن کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ صفحات کی تعداد بڑھانے کے تقاضے بھی شروع ہوئے تو مدیر مخزن نے صفحات کی تعداد بڑھانا شروع کر دیا اور مختلف اوقات میں ۵۶، ۶۰، ۶۴ اور ۷۲ تک اضافہ ہوا۔

اور ایک دور وہ بھی آیا کہ "مخزن" ۸۰ صفحات پر نکلنے لگا لیکن دوسرے اور تیسرے دور میں صفحات کی تعداد کم ہو گئی۔ البتہ جب کبھی خاص نمبر یا سالگرہ نمبر نکلا تو تعداد صفحات بڑھا کر تقریباً ۱۲۵ تک کر دی گئی۔

"مخزن" کے ہر دور میں سائز بھی بدلتا رہا۔ اپنے پہلے دور (اپریل ۱۹۰۱ء تا جنوری ۱۹۲۲ء) میں $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۶}$ سائز پر نکلا اور دوسرے اور تیسرے دور میں $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۸}$ سائز پر نکلتا رہا۔

شیخ عبدالقادر نے اپنے دور میں اس چیز کا خاص اہتمام کیا کہ "مخزن" کو ہر طبقہ کے لوگ پڑھیں اور اس سے مستفیض ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب رسالہ کی قیمت کم ہو۔ چنانچہ انھوں نے رسالہ کو دو طرح کے اعلیٰ و ادنیٰ کاغذ پر نکالنا شروع کیا اور دونوں کی علیحدہ علیحدہ قیمتیں متعین کیں تاکہ خاص و عام آدمی خرید سکے۔

اعلیٰ قسم کے کاغذ پر سالانہ چندہ بلا محصول	سے ر	(تین روپے)
دوئم درجہ ،، ،، ،،	عہ ر	(دو روپے)
محصول ڈاک خرچ	۶ ر	(چھ آنے)
نمونے کے پرچہ کی قیمت	۴ ر	(چار آنے)

اس طرح "مخزن" نے بیسویں صدی کے ربع اول تک بالخصوص اور پانچویں دہائی میں بالعموم اردو زبان و ادب کی نمایاں اور ناقابل فراموش خدمت انجام دیکر اردو رسائل کی تاریخ میں ایک منفرد و ممتاز درجہ حاصل کیا۔

حواشی

۱ انتخاب نقشہ: نادم سیتاپوری ۲ رسالہ "المعارف" (لاہور) فروری ۱۹۸۲ء ۳ رسالہ "مخزن" لاہور مئی ۱۹۰۱ء ۴ ایضاً اپریل ۱۹۰۱ء ۵ تاریخ ادب اردو: رام بابو سکسینہ ترجمہ مرزا محمد عسکری نیشنل بک ہاؤس۔ اردو بازار۔ لاہور ۱۹۳۹ء ۶ رسالہ "نقاد" (آگرہ)، مارچ ۱۹۱۳ء ۷ ایضاً ۸ رسالہ "مخزن" (لاہور) دسمبر ۱۹۱۶ء ۹ رسالہ "الناظر" (لکھنؤ) جون ۱۹۱۹ء ۱۰ رسالہ "مخزن" (لاہور) مارچ ۱۹۲۶ء۔

معارف کی ڈاک

مکتوب ڈربن

جامعہ ڈربن۔ جنوبی افریقہ

۲۷ رمضان المبارک/ ۲۱ مارچ ۱۹۹۳ء

برادر عزیز گرامی قدر جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب   سلام و رحمت فراوان، تسلیمات باکرامت باد۔ رمضان و عید مبارک۔

۲۱ جنوری ۹۳ء کو دار المصنفین اعظم گڈھ میں زوال روس اور سنٹرل ایشیا (ترکستان) سے متعلق سیمینار میں حاضری دیکر واپس آیا تو دم مارنے کی مہلت نہ مل سکی، جامعہ کی تدریسی مصروفیات کے بعد علمی اعتکاف میں چلا گیا۔ زوال روس جدید عالمی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں تقریباً ساٹھ سیمینار میں اس موضوع پر تقریروں کا سلسلہ جاری رہا۔ لوگوں کی دلچسپی اور غیر معمولی انہماک سے خیال پیدا ہوا کہ روس میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو ایک مقالہ کی صورت میں مرتب کر دیا جائے۔ کیونکہ ترکستان کے بخارا و تاشقند و سمرقند کے علاوہ یورپین (European) روس میں مسلم ریاستوں اور ممالک سے متعلق معلومات کی بڑی کمی ہے۔ دوسرے یہ تاریخی حقائق دیگر مسلم اقلیتوں کے لیے درس عبرت ہیں جن سے مستقبل سازی کی راہیں ہموار ہو سکیں گی۔ مقالہ نے کتاب کی صورت اختیار کر لی اور باوجود اختصار و اجمال کے تفصیلات بڑھتی چلی گئیں۔ روس (مغربی روس اور مشرقی روس) میں داغستان کے امام شامل اور دیگر صوفیائے کرام کی تحریک جہاد نے

کس طرح مسلمانوں کے وجود کو بچا لیا، یہ ایک معجزہ سے کم نہیں ہے، سرفروشان راہ حریت کی صد سالہ جد و جہد اور جہاد کی جانبازیاں آج بھی مسلم اقلیتوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

روس نام کی کوئی مملکت صفحۂ ہستی پر موجود نہ تھی۔ سارا علاقہ جسے آج روس کہا جاتا ہے سلاطین تاتار اور منگول کے مقبوضات میں تھا۔ رُس (Rus) نام کا ایک قبیلہ جو باہر سے آکر وہاں آباد ہوا، وہ بھی سلاطین تاتار کا باجگذار تھا اور موسکو نامی گاؤں میں آباد ہوا جو خود سلاطین تاتار کے زیر حکمرانی تھا۔ تاریخی نادانی کہیے یا فراست کی کمی کہ سلاطین تاتار قبائلی تفرقہ کا شکار ہوتے گئے اور عیش و عشرت میں کھوتے چلے گئے اور انھوں نے (Rus) رُسی قبائل کے سرداروں کو تحصیل مالگذاری (Tax-collector-Revenues) کا افسر مقرر کر دیا۔ یہ افسران نواب کے لقب سے نوازے گئے۔ اس عہدہ کے ذریعہ انھوں نے بتدریج معاشی و سیاسی اقتدار حاصل کرنا شروع کیا اور طاقتور ہوتے چلے گئے۔ مسلم حکمران غفلت میں پڑے رہے۔ وہ وقت آگیا جب ان رُسی قبائل کے سرداروں نے سلاطین تاتار کو چیلنج کرنا شروع کیا اور (Tax) دینے سے بھی انکار کر دیا۔ جنگ کا آغاز ہوا۔ Ivans نامی سرداروں نے بالآخر ۱۵۵۲ میں قازان پر جو تاتارستان کا مرکزی علاقہ تھا اور موسکو سے قریب ترین تھا، قبضہ کر لیا۔

سقوط قازان ۱۵۵۲ء سے روس کی اصل تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے سلاطین تاتار کی ریاستیں اور مقبوضات ختم ہوتی چلی گئیں۔ ایک تاتاری مورخ نے حیرت کے ساتھ لکھا کہ (ہم اپنے سابق غلاموں کے غلام کی طرح ہو گئے؟ حیرت ناک بات ہے) کوئی ۳ سو برس ایوان خاندان پھر رامانود کے خاندان کی حکومت رہی انھوں نے اپنا خطاب زار (بادشاہ) روس رکھ لیا۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۹۱ء تک

مارکسی سوشلسٹ نے سارے روس اور مسلم ممالک پر قبضہ کر لیا اور لادینی کا دور شروع کیا۔ دین کے خلاف جنگ ان کا اصل منشور تھا۔ اللہ نے ۷۰ سالوں میں ان کی تاریخ کے ابواب بند کر دیئے۔ زار روس نے شہدائے تاتار کے بریدہ سروں کے ہم شکل گنبد نما چرچ موسکو میں تعمیر کیے جس کی تصویریں اکثر رسائل و مجلات میں آتی رہتی ہیں۔ یہ چرچ مسلمانوں کی شکست کے جشن کی یادگار ہے۔ اس میں شہدا کی داڑھی اور عمامہ کی نقل اتاری گئی ہے۔ یہ روسی صلیب کا سیاہ ترین دور تھا۔ سقوط قازان میں غدار مسلمانوں کا ہاتھ تھا جو دشمنوں سے جا ملے تھے، آج بھی یہ عمل عالم اسلام میں جاری ہے۔ اور زوال امت مسلمہ کے اہم اسباب میں ایک سبب ہے۔

مارچ ۹۲ء میں مسلم روس (Muslim Russia) کے زیر عنوان تالیف کا سلسلہ جاری تھا کہ بوسنیا (Bosnia) کا المیہ پیش آگیا اور سال بھر سے شہادت زار بوسنیا کربلا یا شہدا اکبر بنا ہوا ہے۔ سارا مسیحی یورپ اسلام اور مسلمانوں کو یورپ کی سرزمین سے نکالنے پر کمربستہ ہے۔ روس کھل کر سربیا کی مدد کر رہا ہے اور عالم اسلام سو رہا ہے۔ لب کشائی کی بھی ہمت باقی نہ رہی۔ سابق یوگوسلاویہ کی چھ ریاستوں یعنی بوسنیا (۲) سربیا (۳) کروشیا (۴) سلووینیا (۵) مسی ڈونیا اور (۶) مونٹی نگرو سے اسلام کے خاتمہ کی سعی اسی طرح جاری ہے جس طرح بلقان کی چھ ریاستوں یعنی (۱) یوگوسلاویہ (۲) رومانیہ (۳) ہنگری (۴) یونان (۵) بلغاریہ اور (۶) البانیہ سے اسلام کا انخلاء اور خاتمہ کیا گیا اور ۱۹۱۲-۱۳ میں بلقان کی جنگ میں ترکی مریض ناتواں کے تمام مقبوضات پر مسیحی یورپ نے قبضہ کرنے کے بعد یورپ کی سرزمین کو مسلمانوں سے پاک کرنا شروع کیا۔ مساجد و مدارس کا انہدام

اوقات اسلامیہ و اراضی مسلمین پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو دربدر کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ء میں ترکی جو کبھی عالمی سپر پاور Super-Power تھا مریض ناتواں کی طرح خود اپنی موت و ذلت کی جانکنی میں مبتلا ہوگیا۔ خلافت کے خاتمہ کے بعد سلطنت عثمانیہ کا انہدام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ سارا عالم مسیح آج جدید آلات اور ہتھیاروں سے ظالم سربیا کی مدد کر رہا ہے تاکہ وہ جلد از جلد مسلمانوں کا خاتمہ کر سکے۔ اقوام متحدہ نامی ادارہ انھیں صلیبی قوتوں کا مرکزی آفس ہے veto کے مالک صلیبی اس دفتر کے مالک ہیں۔ جس کی مثال اس شعر کے مترادف ہے

تم ہی قاتل تم ہی شاہد تم ہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پہ

شہادت زار بوسنیا کے زیر عنوان ایک رسالہ مرتب ہوگیا ہے اس میں اس کی چار سو سالہ اسلامی تاریخ آگئی ہے اور عصر حاضر کے واقعات و کوائف کا بھی احاطہ ہوگیا ہے۔ یہ انگریزی زبان میں ہے۔

ہندوستان کی مسلم اقلیت یہ باتیں اچانک نوک قلم پر اس لیے آگئیں کہ ان کا گہرا تعلق ہندوستان کی مسلم اقلیت سے بھی ہے۔ اجودھیا کا واقعہ اسی تعلق کی ایک کڑی ہے۔ ہند میں آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک سمجھی بوجھی پالیسی کے تحت ہو رہا ہے۔ رموز سلطنت خسرواں دانند کے اصول یا فارمولا پر خسرواں کے ملاء اعلیٰ میں ایک نصاب تیار ہوا ہے کہ سرزمین ہند کو مسلمانوں سے پاک کیا جائے۔ اندلس۔ روس۔ بلقان اور یوگوسلاویہ طرز کی اسکیم جاری کی جائے۔ اس نصاب کے مولف بھی اہل صلیب ہیں جو مسلمانوں کے ابدی اور ازلی دشمن ہیں۔ یہ عمل اسی نصاب کے تحت جاری ہے۔ ملاء اعلیٰ سے ملاء ادنیٰ تک اس نصاب کی تدریس میں منہمک ہے۔ لیکن

این محال است و خیال است و جنون۔

آج سے کوئی ۱۷ یا ۱۸ سال قبل ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی کے زیر عنوان ایک کتاب ۱۹۷۶ء میں لندن سے شایع ہوئی۔ اس کے مولف بھی ایک صلیبی مسٹر ہرمین Harman. S. ہیں، کتاب کا مرکزی مضمون اور عمودی خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی طرح کل کا جزء بنادیا جائے تاکہ اتنی بڑی مسلم اقلیت کا اکثریت میں انضمام و انہضام مکمل ہو جائے۔ کتاب ضخیم ہے ادغام کی اسکیم کتاب کے چودھویں باب میں کھول کر بیان کی گئی ہے۔ انضمام کا نسخہ یورپ کے صلیبی نسخہ سے بہت قریب ہے۔ مولف کے مشورہ پر ایک کل ہند جماعت یا تحریک جو اندنوں اڈوانی کی زیر قیادت فعال ہے اور جو مکمل طور پر انضمام و انہضام کی بات ہی نہیں کرتی ہے بلکہ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور ان کی روایات کی تحقیر میں پیش پیش ہے۔ کتاب کے صفحات ۲۲۲ سے ۲۳۲ قابل غور و فکر ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو آج انہیں مشوروں پر عمل ہو رہا ہے۔ مذہب کا مسئلہ ہو یا زبان کا مسئلہ!

کتاب کے مولف تحریر فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہندو اکثریت میں مدغم ہو جانا اس لیے آسان ہے کہ یہ اصلاً سب ہندو تھے۔ زبردستی مسلمان بنائے گئے، آسانی کے ساتھ اپنے اصل مذہب اور عقائد کی طرف مراجعت کرلیں گے (۲۲۲) مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ فوراً اپنے کو ہندو اکثریت میں مدغم کرکے ہندو سرچشمہ اور دھارے کا حصہ بن جائیں (۲۲۲) مسلمانوں کو چاہیے کہ رضاکارانہ طور پر اپنے نام کے آخری حصہ کو ہندو نام کے ساتھ ضم کردیں (۲۲۳) سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ قومی سطح پر ایک ایسی کل ہند تنظیم یا جماعت کی تشکیل کی جائے جس کا مقصد اول ہی "تحریک ادغام و انضمام کی تکمیل ہو" اس تنظیم کی شاخیں ملک گیر طور پر صوبائی مراکز، اضلاع اور شہروں دیہاتوں بلکہ سڑکوں اور چوراہوں پر بھی قائم کردی جائیں تاکہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت میں ضم اور مدغم ہو جانے کی تلقین کی جاتی رہے (۲۲۳-۲۲۴) اس انضمام کے لیے مسلمانوں کو اردو رسم الخط کو فوری طور پر ترک کرنا ہوگا (۲۲۴) توحید امت اور تکمیل ادغام کے لیے مسلمانوں کو اپنا خاص طرز لباس بھی ترک کرنا ہوگا۔ مردوں کے لیے دھوتی کا استعمال ضروری ہوگا اور خاص قسم کی اسلامی ٹوپی کو جو مسلم تشخص اور انفرادیت کی علامت ہے، ترک کرنا ہوگا۔ تاکہ مسلم شناخت باقی نہ رہے۔ مساجد کی تقریبات میں ہندوؤں کی شرکت اور مندروں کی رسومات میں مسلمانوں کی شرکت کو جائز قرار دیا جائے، اس کی کھلی اجازت ہو (۲۲۴) مسجد کی ہر تقریب کو ہندوؤں کی شرکت کے بغیر اور مندر کی پوجا پاٹ کو مسلمانوں کی شرکت کے بغیر نامکمل تصور کیا جائے (۲۳۲) انضمام یا ادغام اور انہضام کی اس پالیسی کو قومی سطح پر نافذ کیا جائے۔ جزء کو کل کا حصہ بنانے کا یہی واحد اور کامیاب طریقہ ہے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کا واحد حل بھی یہی ہے (۲۳۲) اس انضمام کے بعد مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی نفرت کسی حد تک قائم ہو سکتی ہے (۲۳۲)

اس تحریر کا تقابلی مطالعہ اگر روس، بلقان اور یوگوسلاویہ اور اب بوسنیا کے نصاب سے کیا جائے تو تمام خطوط (Patterns) مشابہ نظر آئیں گے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں اقلیتوں کو اس کا حق ہے کہ دنیا میں شایع ہونے والی ان تمام تالیفات اور نصاب کا مطالعہ کرتے رہیں اور اپنے دفاعی مورچے بھی اسی طرح مستحکم کرتے رہیں۔ جس طرح روس کے مسلمانوں نے کیا۔ اس بات کی بھی اشد

ضرورت ہے کہ معارف میں ایک مقالہ وقتاً فوقتاً دنیا کی مسلم اقلیتوں پر شایع ہوتا رہے چونکہ اس کے قاری زیادہ تر ہندوستان کی مسلم اقلیتیں ہیں اس لیے رسالہ کو ان کے تحفظ کی تدبیروں سے واقف رکھنا چاہیے۔ روایتی مقالات (علمی ادبی و دینی) علی حالہ قائم رہیں۔ آخر میں ایک مقالہ مسلم اقلیتوں کے ایسے متعلق ضرور ہو۔ اس لیے بھی کہ ع ہم ہی جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل۔ جب معارف کے پڑھنے والے رہیں گے تو معارف عرفانِ نفس اور تعیینِ ذات کا درس بھی دے سکے گا۔

آپ کے شذرات مذہبی اور قلبی ہوتے ہیں۔ ادبی چاشنی و حلاوت کے علاوہ امت کی بقاء اور اکثریت کے مظالم کی نقاب کشائی میں ہوش و جوش دونوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ الثم زد فزد۔ بعض تبصرہ چونکہ ناگزیر ہے اس لیے اس کی اجازت چاہتا ہوں۔ روایات کا تحفظ و احترام نئی نسل کے لیے لازم ہے لیکن شیخ سعدی اور ان کے سفر ہند سے متعلق کذب بیانی کی داستان پڑھ کر مجھے نہ صرف دکھ ہوا بلکہ حضرت سعدیؒ کے ساتھ صدیوں کی عقیدت میں کمی آگئی۔ جب مجھ جیسے عقیدتمند کا یہ حال ہو سکتا ہے تو جدید نسل کی نظر میں روایات کے احترام کی بات ہی تحصیل حاصل ہے۔ مسئلہ مقالہ کی صحت و عدم صحت کا نہیں ہے بلکہ اس وقت جبکہ امت خود زیست و بقا کے نازک مراحل سے گذر رہی ہے۔ ایسے مقالات تشکیک و ریب میں اضافہ کرتے ہیں[1]۔ ان نازک مواقع پر ایسے مقالات کی اشاعت پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ عربی اور فارسی سے متعلق بعض مقالات بھی محل نظر ہیں کیونکہ اب جدید تحقیق اس قدر آگے جا چکی ہے کہ قدیم اسناد پر قناعت و تکیہ محل نظر ہے۔ میں نے بعض تبصرے لکھے تھے لیکن پھر مصروفیات

[1] اصل چیز تحقیق حق ہے، شیخ سعدی کی اصل عظمت میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا۔

کی وجہ سے ان کو آپ کی خدمت میں ارسال نہ کر سکا۔ نہ ہی ان کی تکمیل ہو سکی[1]۔ بیرون ملک سے آنے والے تمام پرچوں میں مجھے معارف کا انتظار شدت کے ساتھ رہتا ہے مصروفیات کے باوجود دلچسپی اور شغف کے ساتھ مضامین کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اس عرصہ میں کچھ پرچے مجھے نہیں مل سکے ہیں شائد ڈاک کی نذر ہوئے۔ آئندہ کسی خط میں ان شماروں کا ذکر کروں گا جو مجھے نہیں مل سکے۔ چونکہ میں ہر شمارہ کی حفاظت کرتا ہوں لہذا کسی بھی شمارہ کی گمشدگی سے رکارڈ نامکمل رہ جاتا ہے۔ گذشتہ ملاقات کے دوران آپ کی محبت و شفقت اور تواضع و انکساری کا صمیم قلب سے مشکور ہوں۔ دیگر احباب کی خدمت میں بھی شکرانہ ادا کریں۔ میں خاص طور پر ان حاضرین اور سامعین کا مشکور ہوں جنھوں نے ہمارے محاضرہ کو پسند فرمایا۔ تقبل اللہ۔

وقعت الواقعہ

اجودھیا کی تاریخی مسجد کا انہدام کسی خاص جماعت یا قیادت کی سازش کا نتیجہ نہیں ہے اس میں ایک مرکزی ذہن (Mind) از سر تا قدم فعال ہے۔ یہ اسی کا کرشمہ ہے۔ مرکزی و صوبائی حکومتیں، فوج و پولیس تماشا دیکھیں اور انہدام مسجد کا عمل جاری رہے؟ اس حادثہ سے مسلمانان عالم کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ مولانا آزاد کے اس مقالہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جو حضرت مولانا آزادؒ نے مشہد اکبر کانپور کے زیر عنوان ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء کو صفحات ۱۲۰ - ۱۲۳ پر لکھا تھا۔ تقریباً سو برسوں کے بعد بھی یہ مرثیہ زبان حال سے مسلمانوں کے جذبات و صدمات کی ترجمانی کر رہا ہے۔

واقعہ اجودھیا اب واقعہ عالم بن گیا

مولانا آزاد کے گزشتہ ارشادات کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا

[1] مکتوب نگار کی اس رائے پر دوسرے اہل نظر کا کیا خیال ہے؟

ہے کہ اجودھیا کا واقعہ اب اجودھیا کا واقعہ نہیں رہا بلکہ سارے عالم کا واقعہ بن گیا ہر مذہب وملت کے افراد بلکہ لامذہبیوں تک نے انہدام مسجد کی حشر سامانیوں کو اقلیتوں کے عبادت خانہ پر شب خون سے تعبیر کیا۔ اس مذہبی پیکار اور اقلیتوں کے بارے میں پالیسی کے تضادات وتناقضات کو تخریبی میلانات قرار دیا۔ تاریخی حقایق کو اساطیر اور صنمیات میں تبدیل کرنا اور اقلیتوں کے تحفظ کے کوتاہی کو المناک انحراف سے تشبیہ دی۔ جو خود آگہی نہیں۔ خود پرستی وخودکاری ہے۔

بعد میں خیال آیا کہ اجودھیا کی مسجد کی شہادت کے پیچھے یہودی دماغ بھی کارفرما ہے تاکہ انکو اپنے دعویٰ میں تقویت حاصل ہو یعنی حضرت سلیمانؑ کے ہیکل پر مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ یا گنبد تعمیر کی۔ یہ ایک عالمی تحریک چل رہی ہے، میرے پاس ایک مقالہ ہے جو کسی انگریز کا لکھا ہوا ہے، اس کا عنوان یہی ہے کہ مکہ میں خانۂ کعبہ ہندوؤں کا ٹمپل تھا اور ہندو حکمرانوں کی سلطنت عربیہ تک پھیلی ہوئی تھی، خیال تھا کہ اس کی تلخیص کرکے آپ کو ارسال کردوں لیکن قوت دشنے کی وجہ سے نہ کرسکا، یہ سب ایک عالمی منصوبہ کے تحت ہورہا ہے جس کے پیچھے یہودی اور صلیبی ذہن ودماغ فعال ہے، سقوط ڈھاکہ کے وقت ہندی فوج کا کمانڈر انچیف ایک یہودی تھا جس کا ذکر میں نے اپنی کتاب فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات میں کیا ہے، ضرورت ہے کہ ہند کی مسلم اقلیتوں کو ان حقایق سے باخبر رکھا جائے، میرؔ، مومنؔ، انیسؔ ودبیرؔ کے مرثیے تو چلتے رہیں گے، حالات حاضرہ سے متعلق ایک مضمون معارف میں ہونا ضروری ہے یہ پرچہ عام طور پر ذہین لوگ پڑھتے ہیں لیکن وہ بھی حالات حاضرہ اور وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی کی چالوں سے واقف نہیں ہیں اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ کی قرآنی ہدایت بھی پیش نظر رہے تو بہتر ہے۔

والسلام دعاگو دعاجو

سید حبیب الحق ندوی

وفیات

ذکرِ مالک رام

از ضیاء الدین اصلاحی

اردو کے مشہور عالم وفاضل، نامور محقق ومصنف اور غالب وابوالکلام کے عاشق وشیدائی جناب مالک رام کی وفات پر پوری اردو دنیا سوگوار اور اشکبار ہے، ان سے راقم کے جو گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے اس کی بنا پر اس کے لیے بھی ان کی جدائی بہت شاق ہے۔

وہ پھالیہ ضلع گجرات میں جو اب مغربی پنجاب (پاکستان) کا حصہ ہے ۲۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو پوربچہ کھتریوں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے، ان کے والد لالہ نہال چند فوج کے محکمۂ سپلائی میں ملازم تھے، لیکن مالک رام ابھی بارہ۱۲ دن ہی کے تھے کہ والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگئے، والدہ نے پرورش وپرداخت کی، چار۴ برس کی عمر سے تعلیمی سلسلہ شروع ہوا جو ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں منقطع ہوا، اس سے قبل ۱۹۳۱ء میں ان کی شادی ہوگئی تھی۔

مضمون نگاری اور رسالوں کے مطالعہ کا چسکہ بچپن سے تھا، ابتدا میں شعر وشاعری سے بھی کچھ دلچسپی رہی، ان کا پہلا باقاعدہ مضمون نیرنگ خیال لاہور میں چھپا، یہ ٹیگور کی گیتانجلی کے بعض ٹکڑوں کا ترجمہ تھا، اس کے بعد ۱۹۲۶ء کے نگار میں "ذوق اور غالبؔ" کے عنوان سے ان کا مضمون شایع ہوا جس میں آگے چل کر ماہر غالبیات

ہونے والے نے غالب پر ذوق کو ترجیح دی تھی، لاہور میں قیام کی بنا پر نیرنگ خیال کے مدیر حکیم محمد یوسف حسین سے مالک رام کے تعلقات ہو گئے تھے، ۱۹۳۰ء میں ان کی خواہش پر ساٹھ روپے ماہوار پر نیرنگ خیال کی مجلس ادارت میں شامل ہو گئے، پھر لاہور ہی سے شایع ہونے والے "آریہ گزٹ" سے متعلق ہوئے، اس سے علیحدگی کے بعد ۱۹۳۶ء میں روزنامہ "بھارت ماتا" سے منسلک ہوئے، یہ بند ہو گیا تو دلی کا رخ کیا اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کے محکمۂ اطلاعات عامہ سے وابستہ ہوئے پھر جالندھر کی ایک فرم میں بھی ملازمت کی۔

پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں سے مالک رام کی اچھی یاد اللہ تھی۔ ان کی کوشش سے یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو حکومت ہند کے محکمہ تجارت میں ان کا تقرر ہو گیا، تین مہینے کی ٹریننگ کے بعد یکم اگست ۱۹۳۹ء کو انڈین گورنمنٹ ٹریڈ کمشنر کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ہو کر اسکندریہ چلے گئے اور آزادی کے بعد جب انڈین فارن سروس کی تشکیل ہوئی تو اس میں لے لیے گئے اور مصر، عراق، ترکی اور بلجیم وغیرہ میں رہے، سرکاری طور پر ان کو شام، فلسطین، سوڈان، افغانستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور انگلینڈ جانے کا بھی اتفاق ہوا اور بعد میں روس اور ایران کا بھی سفر کیا، سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ساہتیہ اکاڈمی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات کی ترتیب و تدوین کی خدمت پر مامور ہوئے اور اردو سیکشن کے انچارج ہوئے، اکاڈمی سے ضابطہ کا تعلق ختم ہو جانے پر دلی سے ایک تماہی رسالہ "تحریر" کے نام سے نکالا جو بڑا معیاری اور بلند پایہ تھا، لیکن جب اس نے بھی دم توڑ دیا تو جالندھر موٹر ایجنسی لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائرکٹر ہو گئے۔

اردو کے فروغ و ترقی کے لیے جو سرکاری و غیر سرکاری کمیٹیاں بنیں ان میں ان کی

شمولیت ضروری سمجھی جاتی تھی، انجمن ترقی اردو ہند اور غالب اکیڈمی کے وہ برابر ممبر رہے اور انجمن کے کئی برس تک صدر بھی رہے، گجرال کمیٹی اور اردو یونیورسٹی کمیٹی کے بھی وہ رکن تھے اور جامعہ اردو علی گڑھ کے ممبر کے علاوہ پرو چانسلر بھی تھے، اردو کی مدة العمر خدمت کرنے کی وجہ سے اس کے تعلق سے ان کو بڑے سے بڑا اعزاز ملا اور ان کی کتابوں پر مختلف اداروں نے انعام دینے میں فخر محسوس کیا۔ دراصل ان کی ذات اعزاز و انعام سے بالاتر تھی۔

مالک رام صاحب مطالعہ کے بڑے حریص اور شوقین تھے، کتب بینی کی عادت بچپن ہی سے تھی، جس میں سرکاری ملازمت کی مشغولیت بھی مانع نہیں ہوئی، مطالعہ میں کثرت اور انہماک کی وجہ سے بصارت کمزور ہو گئی تھی اس لیے میگنیفائنگ گلاس استعمال کرتے تھے، میری آمد و رفت ان کے یہاں اس وقت شروع ہوئی جب وہ بوڑھے ہو گئے تھے مگر جب بھی انکے کمرے میں داخل ہوا تو پڑھتے لکھتے ہی پایا، کرسیوں اور میزوں پر کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا۔

پنجابی مادری زبان تھی اور اردو سے ان کو عشق تھا، فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی پر بھی عبور حاصل تھا، غالباً ہندی اور بنگالی سے بھی واقفیت تھی اس لیے ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور چونکہ حافظہ بھی اچھا تھا اس لیے جو کچھ پڑھتے تھے اسے مستحضر رکھتے تھے، طبیعت میں سلامت روی، اعتدال اور بے تعصبی تھی اور اصل مقصود علم کی طلب و جستجو تھا اس لیے کسی زبان و مذہب سے متعلق کتاب بھی ہوتی تو اس کا مطالعہ کر کے اپنی علمی تشنگی بجھاتے، کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں انہیں قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق ہوا تو عربی سیکھی اور ایک صاحب سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا، معلم کی مشغولیت کی وجہ سے اس کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکا تو شوقین متعلم نے

خود ترجمہ قرآن کی مدد سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ عرب ملکوں میں رہنے کی وجہ سے عربی میں ان کی استعداد بہت اچھی تھی اور وہ عربی بولنے پر بھی قادر ہو گئے تھے، قرآن مجید میں غور و فکر کا سلسلہ آخر عمر تک قائم رہا۔

تاریخ و ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ ان کا دل پسند شغل تھا۔ غالب و ابو الکلام پر وہ اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں انھیں کئی ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں جاتے وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرتے اور عجائب گھروں کی سیر کرتے۔

مالک رام کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا اور تصنیف و تالیف سے ان کا اشتغال ہمیشہ قائم رہا اس لیے ان کی قلمی فتوحات کا دائرہ وسیع ہے لیکن تحقیق کا میدان ان کی اصل جولان گاہ رہا ہے اور اس میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں' اگست ۷۰ء میں ماہنامہ آجکل دہلی کا "اردو تحقیق" نمبر شایع ہوا، جس میں اردو تحقیق کے چار ستونوں کے ساتھ ان کی بھی تصویر چھپی تھی اور اسی نمبر میں جناب علی جواد زیدی نے ان چاروں ستونوں کو یہ خراج عقیدت پیش کیا تھا:

"جہاں تک تحقیق کے میدان میں رہنمائی کا تعلق ہے، ہمارے سامنے ہندوستان میں چار محققین کے نام بیک وقت آتے ہیں' قاضی عبدالودود، مالک رام، امتیاز علی عرشی' سید مسعود حسین رضوی ادیب۔"

اور اردو ادب کے میر کارواں پروفیسر آل احمد سرور نے خطوط غالب کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"اردو کے محققوں میں مالک رام صاحب کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں، وہ جس

موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس کے ہر پہلو کا غائر مطالعہ کرتے ہیں، تمام ضروری مواد مہیا کرتے ہیں اور نہایت سلجھے ہوئے اور شگفتہ انداز میں یہ مواد پیش کر دیتے ہیں' ان کے یہاں جذباتیت سرے سے نہیں بلکہ ہمدردی کے باوجود ایک معروضی نظر کی کوشش ہے۔"

اردو تحقیق کے تین ستون تو کب کے گر چکے تھے اور اب یہ چوتھا ستون بھی زمیں بوس ہو گیا ع افسوس کہ از قبیلۂ مجنوں کسے نہ ماند۔

مالک رام صاحب کے علمی، تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں بڑی وسعت، تنوع اور رنگا رنگی ہے، ان کی ہر تصنیف علمی، ادبی اور تحقیقی حیثیت سے معیاری اور بلند پایہ ہے غالب ان کی تلاش و تحقیق کا خاص موضوع تھا اور اسی کو ان کے سب کاموں میں اولیت و فضیلت حاصل ہے، غالب پر ۵۰ سے زیادہ مضامین انھوں نے لکھے ہونگے، جن کے دو مجموعے عیار غالب اور فسانہ غالب چھپ گئے ہیں، ۱۹۳۶ء میں پہلی مرتبہ غالب کی کتاب "سبد چین" ایڈٹ کر کے شایع کی، جس میں مرزا کا وہ کلام دیا ہے جو ان کی زندگی میں چھپنے والے کلیات میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا، اسی کتاب کے مقدمہ کے لیے انھوں نے غالب کے حالات لکھنا شروع کیا جو اس قدر پھیل گیا کہ ۱۹۳۸ء میں "ذکر غالب" کے نام سے اسے علیحدہ کتابی صورت میں شایع کیا۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی اور اس کے ۱۵ اڈیشن نکلے ہر اڈیشن نئی تحقیقات پر مشتمل ہوتا تھا، غالب پر جو دو چار اچھی اور مستند کتابیں لکھی گئی ہیں انہی میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے بلکہ حسن تالیف و ترتیب میں یہ زیادہ بڑھی ہوئی ہے، اس کا ہندی ترجمہ بھی ہوا، متعلقاتِ غالب میں ان کی تصنیف تلامذۂ غالب ایک

معیاری اور مستند کتاب ہے، اس کے پہلے اڈیشن میں ۱۴۶ اور دوسرے میں لگ بھگ
پونے دو سو تلامذۂ غالب کے حالات و انتخاب کلام درج ہے، متون کے سلسلہ میں
دیوان غالب' خطوط غالب' دستنبو اور گل رعنا کو شایع کیا، موخر الذکر میں غالب کے
اردو فارسی کلام کا انتخاب ہے جو انھوں نے خود کلکتہ کے مولوی سراج الدین احمد
کی فرمایش پر کیا تھا، اس کو ڈھونڈ نکالنا اور عالمانہ مقدمہ و حواشی کے ساتھ شایع
کرنا مالک رام صاحب کا عظیم الشان کارنامہ ہے، لیکن اول الذکر دونوں کتابوں
کے سلسلے میں اہل نظر کو ان سے بعض بجا شکایتیں رہیں۔ تاہم غالب پر ان کے سارے
کام مجموعی حیثیت سے بہت اہم اور بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں جس کا اندازہ
پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اس تجزیہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:۔

"غالبیات کے سلسلے کا ایک وقیع نام ہے مالک رام کا، پچھلی نصف صدی سے
جن کا ایک ایک لمحہ غالب کے لیے وقف رہا ہے اور جن کے لیے غالب اور اردو
ایک ہی حقیقت کے دو رخ بن گئے ہیں، مالک رام تقریباً پچاس کتابوں کے
مصنف و مولف و مرتب ہیں' ان کی تحقیقات کا دائرہ خاصا وسیع ہے' انکی
خدمات کا اعتراف صرف یہ کہہ دینے سے نہیں ہو جاتا کہ انھوں نے "ذکر غالب"
"تلامذۂ غالب" یا "فسانۂ غالب" لکھیں یا غالب کی بعض تصانیف کو مرتب
کیا یا غالب کے معاصرین' ممدوحین و رفقا پر مضامین قلم بند کیے بلکہ یہ کہ غالبیات
کی موجودہ مستحکم بالشان روایت میں ان کا کام اس بنیادی نوعیت کا ہے کہ اگر
اسے الگ کر دیا جائے تو ہمیں اس میں بہت کمی محسوس ہوگی، مالک رام کا کام
اس پایے کا ہے کہ اسے زندگی بھر کی لگن اور انہماک کی مثال کے طور پر پیش کیا

جا سکتا ہے، اس بات کی پوری معنویت غالبیات کی اعلا علمی روایت کو نظر میں رکھے
بغیر واضح نہیں ہو سکتی۔"

انھوں نے کلیات غالب فارسی کی ترتیب کا کام بھی کر لیا تھا مگر اسکی اشاعت نہ ہو سکی۔
غالب کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے علوم و معارف کی تحقیق و تدوین نے بھی
مالک رام صاحب کی عظمت میں چار چاند لگا دیا ہے، ساہتیہ اکاڈمی نے ترجمان القرآن
کی جو چار جلدیں شایع کی ہیں' ان کی ترتیب و تدوین کے کام میں دوسروں کے ساتھ
ان کی شرکت بھی رہی ہے لیکن غبار خاطر، تذکرہ اور خطبات آزاد کے متون کی تصحیح و
تحقیق کا کام انھوں نے تن تنہا انجام دیا ہے، علامہ سیوطی نے جمع الجوامع کے نام سے
احادیث کا جو مجموعہ مرتب کیا تھا شیخ علی متقی کی کنز العمال اسی کی ترتیب و تنقیح ہے،
لیکن اہل علم کا خیال ہے کہ "سیوطی نے اپنی کتاب لکھ کر دنیا والوں پر احسان کیا اور
شیخ علی متقی نے کنز العمال لکھ کر خود سیوطی پر احسان کیا" یہی بات اگر اس موقع پر
بھی کہی جائے تو بیجا نہ ہوگا چنانچہ مولانائے مرحوم کے ایک بڑے قدرداں جناب
ابوسلمان شاہجہاں پوری رقمطراز ہیں:۔

"غبار خاطر مولانا کی بہترین علمی و فنی تحریروں کا مجموعہ ہے لیکن اس کے افادہ و
فیضان کا دائرہ مکمل نہ تھا، اس دائرے کی تکمیل جناب مالک رام صاحب کے حواشی
سے ہوتی ہے، نادر الوجود اشعار کی طرح جو مولانا نے اس میں استعمال کیے ہیں'
سیکڑوں اشخاص و کتب تھیں جن کے وجود و کمال پر کوئی روشنی نہ پڑتی تھی اور
بے شمار منقولات تھے جن کی صحت کا یقین تھا لیکن عین الیقین نہ تھا، فاضل مرتب
کی تحقیق نے ہمیں ان کے وجود و کمال سے آشنا کیا ہے اور منقولات کی صحت کو

عین الیقین کے مقام پر پہنچا دیا ہے۔"

تحقیق و تحشیہ کے کام میں بعض نقائص اور غبار خاطر سے اجمل خاں صاحب کے ضروری مقدمہ کو حذف کر دینے کے باوجود حق یہ ہے کہ یہ کام مالک رام صاحب سے بہتر شاید کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے متعلقات پر مالک رام نے متعدد وقیع مقالے بھی لکھے ہیں جن کا ایک مجموعہ "کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں" ۱۹۸۹ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی نے شایع کیا ہے، یہ گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔

متون کی تہذیب، تدوین اور تحقیق کے سلسلے میں انھوں نے اور بھی گوناگوں کام انجام دیے ہیں جن میں کربل کتھا بڑا اہم ہے، اس کو پروفیسر مختارالدین احمد کے اشتراک سے مرتب کر کے شایع کیا ہے۔

مالک رام صاحب کی دلچسپی اور تحقیق کا ایک میدان مذہب اسلام بھی ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کے علوم و معارف کی تدوین و تحقیق کا کام اس اعلیٰ اور بلند معیار پر وہ اسی لیے انجام دے سکے ہیں کہ انہیں اسلامیات پر عبور تھا، وہ عربی زبان سے بخوبی واقف تھے اور انھوں نے قرآن مجید اور احادیث نبوی کا مطالعہ براہ راست کیا تھا اس لیے اسلام کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی مطالعہ و تحقیق اور معروضی نقطہ نظر کا نتیجہ ہے، انہیں دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں مذہب اسلام سے زیادہ دلچسپی تھی، خصوصاً عورتوں کے بارے میں وہ اسلامی تعلیم و ہدایت سے زیادہ متاثر تھے، ان کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" اسی تاثر کا نتیجہ ہے جو ان کی برسوں کی محنت، مطالعہ اور تحقیق کا نچوڑ ہے،

"اسلامیات" بھی ان کی محققانہ کتاب ہے جو اسلام کے بارے میں چھ اہم مفید مضامین کا مجموعہ ہے، بعض خامیوں سے قطع نظر یہ دونوں کتابیں مصنف کی غیر جانبداری، بے تعصبی اور مذہب اسلام سے ہمدردی کا ثبوت ہیں، ان میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں ان پر مسلمان فضلا کی نظر بھی شاید ہی گئی ہو سے

سرِّ خدا کہ عارف و سالک بکس نہ گفت — درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

انھی خوبیوں کی بنا پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:۔

"صراحت کے ساتھ اگر اپنا نام ہر بار نہ لکھتے رہیں تو کوئی شخص بھی ان مالک رام اور عبدالمالک کی تحریروں میں فرق و امتیاز کر ہی نہیں سکتا۔"

خاکہ نگاری میں بھی ان کو کمال حاصل تھا، وہ لوگوں کا سراپا بیان کرنے اور اشخاص کی تصویر کشی میں بڑی مہارت رکھتے تھے، ان کی کتاب "وہ صورتیں الٰہی" خاکہ نگاری اور مرقع آرائی کا اچھا نمونہ ہے۔ تذکرہ نگاری سے بھی ان کو خاص مناسبت تھی، ذکر غالب اور تلامذہ غالب اسی ضمن میں آتی ہیں لیکن اس سلسلہ میں ان کا زیادہ اہم کارنامہ تذکرۂ معاصرین ہے جس کی چار جلدیں شایع ہو چکی ہیں اور ایک جلد کے بقدر مواد چھپنے سے رہ گیا ہے، "تذکرۂ ماہ و سال" کی اہمیت بھی مسلم ہے، ان کتابوں میں بعض غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں لیکن علی جواد زیدی کے بقول:۔

"ان تمام تذکروں اور خاکوں کا جمع ہونا معمولی بات نہیں، اس جاں سوز کام کے لیے مالک رام ستائش کے مستحق ہیں ... تذکرۂ معاصرین کا سلسلہ دورِ حاضر کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بے حد مواد مہیا کرتا ہے، اس سلسلے میں تذکرہ نویسی ایک نئے اور ترقی یافتہ روپ میں ظاہر ہوتی ہے، جس لگن

اور خلوص سے مالک رام نے اپنے زمانے کے ادیبوں، شاعروں اور بعض صحافیوں
کے حالات یکجا کر دیے ہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس
طرح کے معلومات کی فراہمی سے سابقہ پڑا ہے۔"

اردو میں یادگار صحیفوں کی اشاعت کی روایت مالک رام صاحب ہی نے قائم کی ہے، اس کی بدولت نذرِ عرشی، نذرِ ذاکر، نذرِ عابد، نذرِ زیدی اور نذرِ حمید جیسی باوقار کتابیں شایع ہوئیں، یہ صحیفے اس عہد کے بڑے بڑے ممتاز اصحابِ علم کی نگارشات سے مزین ہیں، اتنے سارے مضامین کو مالک رام صاحب ہی حاصل بھی کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جن موقر اصحاب کمال کو یہ مضامین نذر کیے گئے ہیں ان کے حالات و کمالات کا پورا مرقع بھی پیش کیا ہے، اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی انھوں نے "نذر" کے مجموعے شایع کیے ہیں اور غالب اور حالی پر بھی انگریزی میں کتابچے لکھے ہیں۔

جس طرح مالک رام صاحب نے دوسروں کی خدماتِ علم و ادب کے اعتراف میں یہ یادگار صحیفے شایع کیے، اسی طرح خود ان کے کمالات کے اعتراف کے لیے ارمغانِ مالک کی دو جلدیں شایع ہوئیں، جن کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے منتخب اہلِ علم کے ایک بورڈ کے تعاون سے مرتب کر کے ۱۹۷۱ء میں شایع کیا تھا، انگریزی میں یادگار صحیفے کو علی جواد زیدی صاحب نے ایڈٹ کیا تھا، وہی "مالک رام ایک مطالعہ" کے بھی مرتب ہیں جو ۱۹۸۶ء میں شایع ہوئی ہے، اس میں ان کے مبسوط مقدمہ کے علاوہ غالبیات، اسلامیات، تذکرہ نگاری، تحقیق، مرقع نگاری، نثر نگاری اور تدوینِ ابوالکلام کے زیرِ عنوان دو درجن سے زیادہ

مضامین شامل ہیں۔

مالک رام صاحب کسی ادارہ اور اکیڈمی سے وابستہ نہیں تھے حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری ملازمت کے علم و ادب کُش ماحول میں رہ کر انھوں نے تن تنہا یہ سارے علمی، ادبی اور تحقیقی کام کس طرح انجام دیے؟

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق　　　ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

مالک رام صاحب اردو کے بہت اچھے نثر نگار تھے، اب ایسی سلیس، صحیح اور خوبصورت نثر لکھنے والے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ انھیں قدرت نے تصنیف و تالیف کا خاص سلیقہ اور بڑا عمدہ ذوق عطا کیا تھا اس لیے ان کی تحریریں خوبی و دلکشی اور رعنائی و بانکپن سے معمور ہوتی ہیں، سادگی اور اصلیت کے باوجود ان کی نثر میں شگفتگی، سلاست، روانی، برجستگی اور پُرکاری ہوتی ہے جو حشو و زوائد، طوالت، تکرار، ایچ پیچ اور ژولیدہ بیانی سے پاک ہوتی ہے، الفاظ اور جملے نپے تلے اور موقع و محل کے اعتبار سے ہوتے ہیں، کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کا ہنر وہ خوب جانتے تھے، مختصر ہونے کے باوجود ان کی تحریریں جامع، پُرمغز، بلیغ اور جاندار ہوتی ہیں، ان کے موضوعات خشک علمی و تحقیقی ہوتے تھے اس کے باوجود وہ تحریر کی دلآویزی اور اثر انگیزی کو قائم رکھتے اور شگفتگی، بے ساختگی اور برجستگی میں کمی نہ آنے دیتے، ان کی عالمانہ، باوقار اور سنجیدہ تحریریں لطافت و حلاوت سے معمور ہوتی تھیں، کبھی کبھی طنز و مزاح کی لطیف آمیزش سے بھی ان کی نثر میں بڑی کیفیت و جاذبیت پیدا ہو گئی ہے، مواد و معلومات کو سمیٹ کر اچھے ڈھنگ اور خاص سلیقے سے پیش کرنے میں مالک رام صاحب کو بڑی مہارت ہے، ان کی

ساری کتابیں مواد و معلومات سے پُر اور مناسب و موزوں ترتیب و تبویب کا اچھا نمونہ ہیں۔

اپنے دور کے اکثر اکابر اور نامور فضلا و مشاہیر سے ان کے اچھے روابط تھے، دارالمصنفین سے ان کے روابط بہت قدیم تھے، جس زمانے میں انھوں نے علمی میدان میں قدم رکھا اس زمانے میں دارالمصنفین اور مولانا سید سلیمان ندوی کے آوازۂ شہرت سے پورا ملک گونج رہا تھا، اس لیے مالک رام صاحب کی نگاہ بھی ان کی جانب اٹھی، غالب کے خطوط میں جب "سبد چیں" کا ذکر پڑھا تو ان کو اس کی تلاش ہوئی اور مولانا سید سلیمان ندوی کو خط لکھ کر اس کے متعلق دریافت کیا، انھوں نے بتایا کہ کتب خانۂ حبیب گنج میں اس کا نسخہ موجود ہے، اس کے لیے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی سے رجوع کیا جائے، معارف میں مالک رام صاحب کے مضامین بھی چھپتے تھے اس کے سلیمان نمبر میں بھی ان کا مضمون شامل ہے، اور ان کی جب بھی کوئی کتاب شایع ہوتی تو اسے دارالمصنفین کو ضرور بھیجتے، یہ معمول آخر تک قائم رہا، اپنی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" کو پریس کے حوالے کرنے سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کے پاس بھیجکر مشورہ و اصلاح کے طالب ہوئے، انکے خلاف جب مولانا امداد صابری نے مقدمہ دائر کیا تو مالک رام صاحب نے نواب سائل دہلوی مرحوم کے ذریعے صلح و صفائی کی پیش کش کی جس میں ان کو کامیابی ہوئی۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب صباح الدین عبدالرحمن صاحبان سے ہمیشہ ان کے خوشگوار تعلقات اور برابر خط و کتابت رہی، انھوں نے نذر کے نام سے جو صحیفے شایع کیے اور خود ان کو جو صحیفہ نذر کیا گیا ان سب کی مجلس ارکان

میں شاہ صاحب کا نام اور حصہ مقالات میں صباح الدین صاحب کے مضامین شامل ہیں، مجھے یاد نہیں کہ پہلی مرتبہ کب میرے کان میں مالک رام صاحب کا نام پڑا لیکن فروری ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی گولڈن جبلی بہت دھوم سے منائی گئی جس میں ارباب دُوَل کے ساتھ ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے مشاہیر علماء و فضلاء بھی شریک ہوئے، اسی موقع پر مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ساتھ جب انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو ان کی پاکیزہ صورت اور پُرکشش شخصیت نے اپنی جانب متوجہ کر لیا، مجھ پر ان کی قابلیت اور وسعت علم و نظر کا سکہ اس سے پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا، مئی ۱۹۶۱ء کے معارف میں مقریزی اور ان کی خطط پر میرا ایک مضمون شایع ہوا، اس میں میں نے مقریزی کی کسی تصنیف کو غیر مطبوعہ بتایا تھا، یہ مضمون مالک رام صاحب کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اس وقت کے اڈیٹر معارف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کو لکھا کہ مقریزی کی یہ کتاب طبع ہو چکی ہے، شاہ صاحب نے جب ان کے گرامی نامہ کا مجھ سے تذکرہ کیا تو مجھے پسینہ آگیا مگر شاہ صاحب نے میری دلجوئی کے لیے فرمایا کہ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اتنے بڑے آدمی نے تمہارا مضمون پڑھا۔

ساہتیہ اکاڈمی سے مالک رام صاحب نے جب غبار خاطر کا محقق و محشی ایڈیشن شایع کیا تو راقم نے معارف میں اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ "حواشی میں فاضل مرتب سے بعض اغلاط سرزد ہو گئے ہیں"۔ اسے پڑھ کر انھوں نے پھر شاہ صاحب کو تحریر فرمایا کہ "اغلاط سے مبرا ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اگر ان کی نشاندہی کر دی جائے تو آیندہ اڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی، شاہ صاحب

نے ان کا گرامی نامہ میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا " مالک رام صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں اس لیے اغلاط کی دو چار مثالیں ضرور دینی چاہیے تھی، میں نے عرض کیا کئی غلطیاں ہیں، معارف کے مختصر تبصرے میں ان کی صراحت کی گنجایش کہاں ہوتی ہے، شاہ صاحب نے فرمایا اب تم خود ان کو خط لکھو جس میں غلطیوں کی نشاندہی کردو، محترمی سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب بھی موجود تھے، انھوں نے فرمایا کہ میں بھی کچھ اغلاط کی نشاندہی کرتا ہوں، انہیں بھی اپنے خط میں شامل کرلینا، اس طرح ان کے تعاون سے تقریباً ۵۰ غلطیاں قلم بند کرکے ان کی خدمت میں بھیجی گئیں جن کو ملاحظہ فرمانے کے بعد انھوں نے مجھے شکریے کا خط لکھا اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ اکثر سے مجھے اتفاق نہیں ہے لیکن جن سے اتفاق ہے آیندہ اڈیشن میں ان کے مطابق صحت کردی جائے گی۔

اس خط سے میرے دل میں ان کی بڑائی جاگزیں ہوگئی اور اس کے بعد ان سے برابر خط وکتابت کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ کبھی کبھی سنین وغیرہ کی تحقیق اور بعض دوسرے امور دریافت کرنے کے لیے وہ مجھ ہیچ مداں کی جانب رجوع بھی فرمانے لگے۔ ۱۹۸۲ء میں ہمدرد نگر نئی دہلی میں بین الاقوامی قرآن کانگریس کا انعقاد ہوا جس میں سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے ساتھ میں بھی شرکت کے لیے گیا تھا، کانگریس کے اجلاس پانچ چھ روز تک ہوتے رہے، مالک رام صاحب تقریباً روزانہ شرکت کے لیے اپنے دولت کدہ سے جو ڈیفنس کالونی میں تھا تشریف لایا کرتے تھے اور ان سے متعدد علمی امور و مسائل پر گفتگو رہتی، ان صحبتوں سے ان کے عجز وانکسار، شرافت، شائستگی، بے تعصبی، رواداری، فراخدلی، خورد نوازی، عالمانہ شان اور تحقیقی مزاج کا اچھی طرح اندازہ ہوا۔ (باقی)

مطبوعات جدیدہ

مآثر مولانا ابوالکلام آزاد از پروفیسر خلیق احمد نظامی، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۱۷، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵۰ روپیے، پتہ: ادارۂ ادبیات دلی، قاسم جان اسٹریٹ ۲۰۰۹، دہلی نمبر ۶۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نامور مورخ اور مشہور مصنف ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد پر ان کی باوزن کتابوں سے علمی وتاریخی سرمایے میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے، ہندوستان کی ولی اللّٰہی تحریک اور اس کے اثر سے وجود میں آنے والی دوسری تحریکوں کے علاوہ انھوں نے جنگ آزادی کی تاریخ کا مطالعہ دقت نظر سے کیا ہے، ہندوستان کی جنگ آزادی کے رہنمائے اعظم مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی وشخصیت بھی ان کے مطالعہ کا موضوع رہی ہے، اس کتاب کے پانچ حصوں میں مولانا کی علمی، ادبی، تاریخی بصیرت، سیاسی شعور اور اولوالعزمانہ جدوجہد وغیرہ مختلف مآثر ومفاخر کا مرقع پیش کرکے اپنا جوہر اور کمال ہنر دکھایا ہے، پہلے مولانا کے بحر علم کی بے پایانی کا ذکر اور ان کی ذات میں آباد علم وعرفان کی دنیا کی سیر کرائی ہے اور ان کے علمی تبحر کے اسباب وعوامل کا تجزیہ کیا ہے، اس سلسلہ میں ان کے مطالعہ میں انہماک، غیر معمولی حافظہ، لسانی صلاحیتیں، مختلف زبانوں پر عبور، متعدد فنون میں جامعیت، ذوق علم وادب، بلند ادبی معیار، شاعرانہ مذاق، موسیقی سے واقفیت، تاریخ سے دلچسپی اور اس سلسلہ کے خاص امتیازات، قدیم کلام وفلسفہ، بلاغت وتفسیر، موجودہ فلسفیانہ وسائنسی افکار ورجحانات سے باخبری،

عصری تقاضوں اور سماجی ضرورتوں پر گہری نظر،عالمی اور اسلامی دنیا کی سیاسی و مذہبی تحریکوں کا وسیع مطالعہ، جمالیاتی ذوق، محققانہ نظر، مجتہدانہ بصیرت، ہر مسئلہ کے تاریخی، نفسیاتی، عملی اور اعتقادی پہلوؤں کی وضاحت، اسلوب بیان، اردو کی ترقی کی جد و جہد وغیرہ مآثر کا ذکر مولانا کی تحریروں اور تقریروں کے حوالہ سے کیا ہے، دوسرے حصہ میں مولانا کے تاریخی شعور و بصیرت کے عالمانہ تجزیہ میں احساسِ زماں کی نزاکت، زندگی میں اوقات کی پابندی کے اہتمام، تاریخی دیدہ وری، تاریخی نقطۂ نظر، تاریخ ہند سے متعلق ان کے خیالات کی وسعت و گہرائی پر روشنی ڈالی ہے، تاریخی تحقیق میں آرکائیوز پر انکے زور دینے اور آثار قدیمہ کو قدیم تاریخ کا ماخذ قرار دینے اور غیر معمولی حافظہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے، تیسرے باب میں دکھایا ہے کہ سرسید سے اختلاف کے باوجود مولانا پر ان کا جو اثر پڑا اس نے بھی ان کی عظمت و توقیر بڑھائی تھی، چوتھے حصہ میں مولانا کے قائدِ حریت ہونے کے ثبوت میں ان کے فطری انقلابی جذبات، حصول آزادی کے لیے بے نظیر قربانی، عدم تشدد کی گاندھیائی پالیسی سے مولانا کے اتفاق و اختلاف کے حدود اور قومی وحدت اور ملک کی سالمیت کو ہر حال میں مقدم سمجھنے کو پیش کیا ہے، سیاسی جھمیلوں میں پڑنے کے اسباب و محرکات بھی زیر بحث آئے ہیں اور جد و جہدِ آزادی میں مولانا کے کارنامے مختلف عنوانات کے تحت قلم بند کیے گئے ہیں، آخری باب میں انڈیا ونس فریڈم کے تیس صفحات کے متعلق فضول ولایعنی بحثوں کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ ان میں ظاہر کیے گئے تمام خیالات مولانا ہی کے ہیں، فاضل مصنف نے عقل و نقل اور واقعات و حقائق کی کسوٹی پر پرکھ کر انہیں صحیح اور مولانا کے سیاسی تدبر پر مبنی قرار دیا ہے، کتاب سے علم و تاریخ پر مصنف کی گہری نظر اور بحث و تجزیہ کی مورخانہ

بصیرت اور دیدہ وری کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب مولانا کے مآثر اور افکار کا مرقع ہی نہیں ہے بلکہ نصف صدی کے تاریخی و سیاسی واقعات اور قومی جد و جہد کی روداد بھی ہے، آخر میں مولانا سے مصنف کے قرب و تعلق کا تذکرہ اور ان کی ایک تاریخی تقریر کا متن درج ہے اور شروع میں حضرت مولانا علی میاں کا جاندار پیش لفظ بھی اس کی زینت ہے۔ "ض"

آپ بیتی عباس محمود العقاد مترجم جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، لمبی تقطیع عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، صفحات ۳۰۴، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی ۲۲۱۰۱۰۔

عباس محمود العقاد مصر کے صاحب طرز ادیب، انشا پرداز، نقاد، محقق، شاعر اور صحافی تھے، تاریخ اور سیرت نگاری میں ان کی تصنیفات مشہور و مقبول ہوئیں، ان میں بھی ان کا سلسلۂ عبقریات زیادہ ممتاز ہے، جس میں رسول اکرمؐ اور بعض کبار صحابۂ کرامؓ کے سوانح شامل ہیں، ان کے علاوہ بعض اسلامی موضوعات پر ان کی قابل قدر تحریریں ان کے غور و فکر اور دلکش و شگفتہ اسلوب کی وجہ سے غیر عربی زبانوں میں منتقل ہوئیں، زیر نظر کتاب ان کی مشہور آپ بیتی 'انا' کا ترجمہ ہے، کاروانِ زندگی کے نقوش اور اس کے نشیب و فراز کی یہ داستان نہایت دلچسپ ہے، بچپن، زمانۂ طالب علمی، خاندان، احباب، اساتذہ، ہم عصر، ماحول اور مطائب و مکروہات اور کچھ کھونے اور پانے کے واقعات اپنے دامن میں بصیرت و عبرت کی داستان سمیٹے ہوئے ہیں، ان کی یہ آپ بیتی ضمناً ان کے عہد کی تاریخ بھی ہے، ترجمہ عموماً سلیس و رواں ہے، مترجم عربی اور اردو کے مشاق اہل قلم ہیں، اس کے باوجود تعجب ہے کہ کہیں کہیں

بالکل تحت لفظی ترجمہ کیا ہے اور بعض جگہ عبارت میں اغلاق و ابہام ہے، مثلاً "میں نے خود سے محبت نہیں کی مگر ایک مناسب سبب کی وجہ سے جس کے باعث زندگی کا مستحق بنا ہوں، اگر یہ سبب موجود نہ ہو تو زندگی کی لحظہ بھر کے لیے میرے نزدیک کوئی اہمیت نہ ہوگی" "خیال کا دوسرے خیالات تک ایک الہام اور دل کی ایک پکار ہے دوسرے دلوں کے لیے" "نظام کی مخالفت اور واجبات کی ادائیگی میں گریز میں انتہا پسند تھا" "محبت طبیعت جنسیہ نہیں کیونکہ غریزۂ جنسیہ مرد اور عورت دونوں میں پائی جاتی ہے" "کبھی محبت تمام چیزوں سے خالی ہو کر صرف ایک صفت سے متصف باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے اہتمام" "پھر یاد میں مبالغہ سے قبل میں نے اپنی طرف رجوع کیا" "ہاں اگر دوام مطالبہ ضروری ہو جائے تو پھر سردی کا دوام ہو" "جوانی اور بڑھاپے میں بہت سے فرق ہیں بلکہ یہ صحیح ہے کہ دنیا کی حالتوں میں کن ہی دو حالتوں میں اتنا فرق نہ ہوگا" "اپنی طبعی عادتوں کی تفسیر سے میں ان اوہام کی بھی اصلاح کرسکوں گا جو الفاظ کے مفہوم کو سمجھنے میں پیدا ہوتے ہیں" "اشیاء کے اندر لوازم و ملابسات سے فرق ہو جاتا ہے" "عالم کتب میں خنصر و بنصر کے مابین انتقال کس قدر دور ہے" "عورت کی جانب نظری زندگی کے بارے میں نظر کا معیار ہے جو اس پر غصہ کا سبب ہے اس کی تعظیم کے باعث" "اپنے الہام کو سمجھ نہیں سکتا کیونکہ اسے وہ عالم نسب (؟) سے حاصل کرتا تھا" "ایک جسم جو فرط محرومی سے متمرد ہوگیا ہے اور ایک روح جو شہوات سے فرط استمتاع کی وجہ سے متمرد ہوگئی ہے" "ہم اب بھی مجلس سماع میں جنسی و جسمانی بن کر جاتے ہیں"۔ بعض جگہ خالص عربی الفاظ ہی منتقل کر دیے گئے ہیں، مثلاً استطرادی اسلوب، ایام واسابیع، متباعد قطبین، مسور اور فول،

کیمیا فیلیہ ذرائع، شعور و طرائف، احساس پرستوں کے صحائف، موسیقی عالیہ، بعض الفاظ کا مفہوم بھی صاف نہیں ہے جیسے "نظام و شیطنت یا نظام و خلاف ورزی" یہاں نظام سے شاید نظم و ضبط اور ڈسپلن مراد ہے، "مجھے سرعت سے محبت تھی" سے مقصود شاید یہ ہے کہ میں عجلت پسند تھا۔ کتابت کی غلطیاں بھی جا بجا ہیں جیسے سدا کو صدا، تعتیم کو تعیم، ملٹن کو ملمن لکھدیا گیا ہے۔

قومی کتابیات (شعبۂ اردو) ۱۹۸۶-۸۷ء

مدیر: اقبال احمد، لمبی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۸، قیمت درج نہیں، پتہ: بھاشا وبھاگ، اتر پردیش سرکار، لکھنؤ۔

ہندوستانی قومی کتابیات کے موضوع پر اتر پردیش کی حکومت قریباً آٹھ دس برس سے ہندی اور اردو میں ہر سال ایک فہرست کتابیات شایع کرتی ہے، اس میں ملک میں ہر سال شایع شدہ کتابوں اور رسالوں کا تعارف کرایا جاتا ہے، زیر نظر مجموعہ ۸۷-۱۹۸۶ء کی کل ۵۸۳ مطبوعات پر مشتمل ہے جو ڈیلیوری آف بکس اینڈ نیوز پیپرس ایکٹ کے تحت نیشنل لائبریری کلکتہ کو موصول ہوئی تھیں، ان مطبوعات کو سلیقہ سے تین حصوں یعنی مضامین، اشاریۂ مصنفین و کتب اور اشاریۂ مضامین کے تحت تقسیم کرکے الگ الگ موضوعات مثلاً مذاہب، فلسفہ، منطق، عمرانیات و سیاسیات وغیرہ خانوں میں رکھا گیا ہے، آسانی کے لیے مذاہب میں بھی اسلام، برہمنیت، بدھ مت اور سکھ مذہب کے تحت کتابوں کو تقسیم کر دیا گیا ہے، پھر مصنفین و مضامین کے اشاریہ کے ذریعہ ان کی تلاش اور بھی آسان کر دی گئی ہے، اس فہرست کتابیات سے ہندوستان میں اردو دنیا کے مذاق و مزاج کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ادبیات میں

۳۰، مذہبیات میں ۴۸، تاریخ میں ۶۳، عمرانیات میں ۳۸ کتابیں ہیں اور فلسفہ وسائنس اور فنون لطیفہ میں کل ۱۳ کتابوں کا اندراج ہوا۔ عربی ٹائپ میں طباعت بہتر ہے، البتہ اندراجات میں چند غلطیاں ہیں مثلاً عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی مرحوم کو ابوعبدالرحمٰن لکھدیا گیا اور شمس تبریز کے بجائے طبریز چھپ گیا۔

ماسونیت، ایک تاریخی دستاویز از جناب محمد صفوت سقا امینی سعدی ابوحبیب، ترجمہ از مولوی عبدالوہاب حجازی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۱، قیمت ۱۶ روپے، پتہ: مکتبہ سلفیہ، مرکزی دارالعلوم ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰۔

رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے شایع ہونے والی اس کتاب میں ماسونیت کی تاریخ، اس کے اصول وضوابط، یہودیت سے اس کے ربط و تعلق اور اسلام و مسلمانوں کے متعلق اس کی فتنہ انگیزی کی حیرت انگیز داستان بیان کی گئی ہے، اس تحریک نے خلافت عثمانیہ کے سقوط میں مصطفیٰ کمال، خالدہ ادیب، جاوید جمال سفاح انور، طلعت وغیرہ کو اپنے دام تزویر کا شکار کیا، موجودہ زمانہ میں بعض عرب سربراہوں کا تعلق بھی اس جماعت سے ثابت ہوا، یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اکثر اسلام دشمن تحریکوں کا مزاج اور طریقۂ کار خفیہ و باطنی قسم کا رہا ہے، ماسونیت پر علامہ رشید رضا مصری کے ایک فتویٰ کے علاوہ فقہ اکیڈمی مکۃ المکرمہ کی ایک قرارداد بھی کتاب میں شامل ہے، ترجمہ سلیس ہے تاہم کہیں کہیں بعض عربی الفاظ و تعبیرات کو اور زیادہ آسان کیے جانے کی ضرورت تھی۔

ع۔ص